www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2019

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

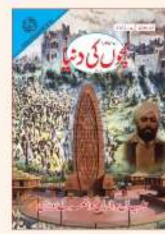

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	ملکہ نور جہاں: ایک ہمہ گیر شخصیت	ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		8
جہان نسواں	اردو کی خواتین تاریخی ناول نگار	ڈاکٹر شمع پروین	9
	جوگیا: رنگ و رومان	ڈاکٹر شیوبہ ترپاٹھی	15
	آزادی کے بعد عورتوں کی سماجی حیثیت	فردوس احمد میر	22
	خدیجہ مستور، 'زمین' اور معاشرتی مسائل	فیاض حمید	27
	مایوسیت اور تعلیمی تحصیل	شائستہ پروین	31
	امرتا پریتم کے ناول 'پنجر' میں عورت کا کردار	تبسم بانو شاہ	35
	اردو ادب میں تانیثیت	نازمین	40
کہانیاں	ادھوری نشانی	ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ)	43
	بوجھ	نصرت شمسی	45
	تقدیر	انزیلہ انصاری	47
حسن سخن	شہناز فاطمہ صدیقی، ایمن تنزیل		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		53
صحت	آدھی آبادی کے صحتی مسائل	ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی	55
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 7 جولائی 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

کتابوں سے دلچسپی ہر باذوق فرد کو ہوتی ہے۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق قارئین کتابوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کتابیں بہترین ساتھی ہوتی ہیں۔ کتابوں کی اہمیت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ کتابیں علم کا خزانہ ہوتی ہیں۔ کتابوں سے نہ صرف کسی ایک عہد کے لوگ استفادہ کرتے ہیں بلکہ یہ آنے والی نسلوں کی آبیاری کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ کتابیں نہ صرف ہماری دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں بلکہ وہ ماضی کے تمام قصوں کو جو ہمارے حافظے کا حصہ نہیں بن پاتے ان کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ کتابیں ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہیں اور انسانیت کا درس بھی دیتی ہیں۔ کتابیں ہمارے لیے کسی ورثے سے کم نہیں ہیں لیکن تشویشناک بات یہ ہے کہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہمارا کتابوں سے رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ٹکنالوجی کی وجہ سے روز بہ روز نئی نئی تبدیلیاں ہماری زندگی میں رونما ہو رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں جہاں ایک طرف ہمارے لیے فائدے مند ثابت ہوتی ہیں، وہیں دوسری طرف ان کے مضر اثرات بھی ہماری زندگی پر پڑتے ہیں۔ آج کا قاری موبائل کے ذریعے کتابوں کے مطالعے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ کتابوں کو ہاتھوں میں لے کر پڑھنے کے بجائے وہ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے کتابوں سے مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ ایسے میں ہم اپنے قیمتی ورثے کی حفاظت کیسے کر سکتے ہیں یہ ہمارے لیے فکر انگیز بات ہے۔ قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے نئی نسل کو کتابوں سے جوڑنے کے لیے قومی کونسل کتاب میلے کا انعقاد کرتی رہتی ہے تاکہ شائقین کا رشتہ کتابوں سے ہمیشہ برقرار رہ سکے۔

قومی اردو کونسل کے ذریعہ منعقد کیے جانے والے کتاب میلوں کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ قاری کی نادر و نایاب کتابوں تک رسائی آسان ہو سکے۔ آج جدید ٹیکنالوجی نے کتابوں کی فراہمی کے مسئلے کو آسان کر دیا ہے۔ تمام علوم کی کتابیں انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں لیکن کچھ علاقے ہنوز ایسے بھی ہیں جہاں اچھی اور معیاری کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ قومی اردو کونسل عوام سے کتابوں کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کرتی ہے۔ مفید اور کارآمد کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ کونسل نے ایک ایسا ای پب ریڈر ایپ تیار کیا ہے جس کے ذریعے کونسل کی کتابیں ڈاؤن لوڈ کر کے آسانی سے پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس جدید ٹیکنالوجی نے کتابوں کے حصول کی راہ آسان کر دی ہے۔ اب ہر کوئی اپنے ذوق کے مطابق کسی بھی قسم کی کتابیں مثلاً ادب، ثقافت، تاریخ، سیاست، سائنس، لسانیات، علم طب غرض کہ ہر موضوع سے متعلق کتاب مختلف ویب سائٹس سے ڈاؤن لوڈ کر کے بہ آسانی پڑھ سکتا ہے اور ان سے استفادہ بھی کر سکتا ہے۔

انٹرنیٹ یا جدید ٹیکنالوجی سے ہم استفادہ ضرور کر سکتے ہیں لیکن علم کا حقیقی خزانہ کتابوں میں ہی موجود ہوتا ہے۔ کتابیں ہماری تہذیب و ثقافت کا حصہ ہیں۔ کتابوں کے ذریعے ہی انسان علم سیکھتا ہے اور زندگی میں آگے چل کر مختلف میدانوں میں اپنی ہنرمندی اور فنکاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کتابوں کے ذریعے ہی ہم یہ جان پاتے ہیں کہ ہمارا ماضی کیا تھا۔ کتابیں ہمارے علم میں وسعت و گہرائی پیدا کرتی ہیں کیونکہ کتابیں اپنے اندر علم کا سمندر رکھتی ہیں۔ اس امر پر بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم کیسے کتابوں سے اپنا رشتہ استوار کریں اور اپنے قیمتی ورثے کی حفاظت کے کون سے موثر طریقے اختیار کریں۔ قومی کونسل کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے کارنامے خاموشی سے انجام دے رہی ہے جن کے ذریعے ہم اپنی تہذیب اور ثقافت کو باقی رکھ سکتے ہیں اور اپنے قیمتی ورثے کو بکھرنے سے بچا سکتے ہیں۔ اردو کتاب میلہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے تاکہ کتابوں سے قارئین کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

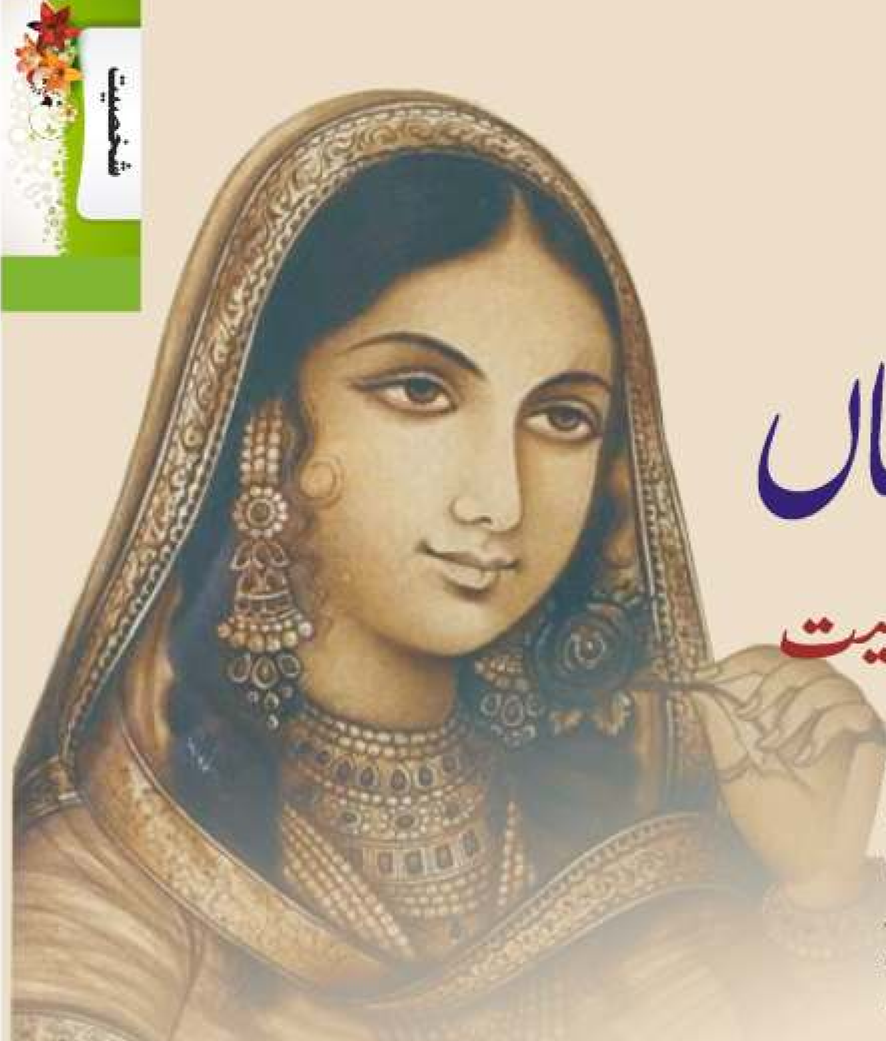

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

ملکہ نور جہاں

ایک ہمہ گیر شخصیت

خاندان مغلیہ کی ملکہ اول میں ملکہ نور جہاں بیگم کا شمار ہوتا ہے۔ وہ شہنشاہ جہانگیر کی ایک محبوب، چہیتی بیگم تھی جو اپنی عقل وفراست سے خاندان مغلیہ کی ایک حکمراں بن گئی۔ نور جہاں کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی ۔ وہ گوناگوں اوصاف کی حامل تھی۔ وہ بیک وقت بحیثیت ایک خاتون، بیوی، مشیر، فنکار، شاعرہ اور ایک حکمراں کا مجموعہ تھی ۔ اس نے سب حیثیتوں سے اپنے فرائض کی تکمیل بحسن وخوبی انجام دیں۔

نور جہاں مرزا غیاث بیگ اور عصمت النساء بیگم کی اولاد تھی۔ نور جہاں کی پیدائش مرزا غیاث بیگ کے سفر ہندوستان کے دوران 948ھ میں قندھار کے جنگلوں میں ہوئی تھی۔ غیاث بیگ دربار اکبری میں دیوان بیوتات، مقرر ہوئے، عصمت النساء حرم شاہی میں شہزادیوں کی اتالیق مقرر ہوگئی۔ شاہی محل میں آمد ورفت ہونے لگی، لڑکی پانچ سال کی ہوئی تھی کہ مرزا غیاث بیگ نے نام رکھنے کی تقریب کا اہتمام کیا۔ شمس النساء نام تجویز ہوا لیکن لڑکی مہر النساء کے نام سے مشہور ہوئی۔

محلات شاہی کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ مہر النساء کے تعلیمی مراحل طئے ہونے لگے۔ مہر النساء بہت خوش الحان تھی۔ قرآن پڑھا، مرزا ہادی سے گلستان، بوستاں، انوار سہیلی اور علم فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ فارسی کے علاوہ عربی، سنسکرت اور بھاشا بھی سیکھی۔ باپ اور بھائی سے نیزہ بازی، تیر اندازی اور شہسواری کے فنون سیکھے۔ ماہی خانم نے تیراکی میں مشتاق کر دیا۔ دس برس کی عمر میں بہت کچھ سیکھ لیا۔ اس کی ذہانت وفطانت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی محلوں میں دھوم تھی۔ حسن وجمال کا بھی شہرہ تھا۔

مہر النساء نے بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھا۔ ایک تو مہر النساء بہت ہی حسین جمیل دوشیزہ تھی۔ شاہی محل اور مینا بازار میں شہزادہ سلیم سے ملاقات ہونا لازمی تھی۔ دوسرے سلیم بھی بچپن سے عاشق مزاج ثابت ہوا۔ وہ شراب اور شباب کا دیوانہ تھا۔ رومانی مزاج کا پروردہ تھا۔ سلیم اور مہر النساء کی ملاقات کے افسانے گوش گزار ہوتے ہیں۔ لیکن مورخین کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ 908ھ میں مہر النساء کی شادی علی قلی خان عرف شیر افگن سے ہوجاتی ہے۔ شیر افگن کے مارے جانے کے بعد مہر

النساء آگرہ واپس آئی۔ 1014ھ میں اکبر اعظم کی وفات ہو چکی تھی۔ اِدھر مہر النساء کو اس کی ماں اور لڑکی لاڈلی بیگم کے ساتھ گرفتار کر کے جہانگیر کے حضور بھیج دیا تھا۔ تزک جہانگیری میں شیر افگن کے متعلق لکھا ہے ''تم اس ترکمان زادے کو ہمارے حضور میں بھیجو تا کہ ہم حقیقت حال سمجھ سکیں اس سے استفسار کرنے کے بعد اگر وہ مجرم قرار پائے تو قانون کے مطابق فیصلہ فرمائیں۔ اگر وہ مائل بہ سرکشی ہو یا حاضر ہونے سے انکار کرے تو اس کی گوشمالی کی جائے۔

جہانگیر نے مہر النساء کو اپنی رضاعی ماں سلیمہ بیگم کے سپرد کیا۔ آخر چار سالوں کے بعد جہانگیر نے 25/مئی 1611 میں نور جہاں سے شادی کی۔ (برٹش میوزیم مخطوطہ۔ 3276)۔ نور جہاں سے قبل جہانگیر کی بارہ شادیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے متعلق 'دربار اکبری' 'مذہبی رواداری' حصہ دوم وسوم' اور 'ہندوستانی مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے' کے مورخین و مصنفین نے جہانگیر کی ان ۱۲ شادیوں کے بارے میں مفصل لکھا ہے۔ یہ رشتے اکبر نے سیاسی مصلحت کی بناء پر انجام دیے تھے۔

جہانگیر سے شادی کے بعد نور جہاں کی مخفی صلاحیتوں میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ نور جہاں جس قدر حسین وجمیل تھی اتنی ہی جہانگیر کی نور نظر تھی۔ وہ واقعی بہت عقلمند، دور اندیش اور ذہین عورت تھی۔ حالات پر نظر رکھتی تھی۔ بڑی ذہانت وفطانت سے بادشاہ اور لوگوں کے دلوں میں جگہ پائی۔ بادشاہ نے پہلے اسے نور محل، بعد ازاں نور جہاں، کا خطاب عطا کیا۔ فرامین شاہی پر ملکہ کی مہر ثبت ہونے لگی۔ اس کے اعزہ واقارب کے مدارج ومناصب میں اضافہ ہوا۔ مغلیہ سلطنت کی باگ ڈور اب اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ بادشاہ کی علالت کے دوران جھروکے سے درشن دینے کی رسم نور جہاں ادا کرتی تھی۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے ''من سلطنت را نور جہاں ارزاں داشتم وبجز یک سیر شراب ونیم سیر گوشت مرا ہیچ در نمی باید۔'' اب بادشاہ انتظام حکومت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ 1627 تک جہانگیر کی وفات تک جو چاہا کیا لیکن ملکہ کے بھائی آصف جاہ اور شاہجہاں نے اسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے روکے رکھا۔ جہانگیر کے انتقال کی خبر پاتے ہی بھائی آصف جاہ نے نور جہاں کو نظر بند کر دیا اور اپنے داماد خرم عرف شاہجہاں کو پیغام بھیجا کہ وہ فوراً پہنچے۔ پیغام ملتے ہی وہ روانہ ہو گیا اور تاج وتخت پر قبضہ کر لیا۔

نور جہاں ذہین خاتون تھی۔ اس نے زیور، پوشاک، بناؤ سنگھار اور گھر کی آرائش میں پردے وغیرہ کا استعمال اور نئی نئی ایجادکیں۔ ساڑی کو محل شاہی میں اس نے رواج دیا تھا۔ اس کے علاوہ دودامنی پشواز، پچتولہ، اوڑھنی، باؤلہ کی تاری وغیرہ بھی اس نے رواج دی۔ گلاب کا عطر بھی اس کی ایجاد ہے۔ شاہی محل میں جشن کی سجاوٹ وغیرہ کا انتظام ملکہ کے ذمے ہوتا تھا۔ اس نے زردوزی، زربفت اور قالین کے نمونے ایجاد کیے۔

ملکہ شیریں زبان تھی ۔ بڑا نرم و نازک لب و لہجہ اور آہستگی سے گفتگو کرتی تھی۔ دوسروں کو بلند آواز سے گفتگو کرنے سے منع کرتی تھی۔ ہر سال حج کے لیے لوگوں کو بھیجا کرتی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہی مستحقین اور سفید پوشوں کے علاوہ غربا، یتیموں، محتاجوں، بیوہ اور غریب عورتوں کے لیے اس کا دم سرچشمۂ حیات تھا۔ اس نے ہزاروں غریب لڑکیوں کی شادیاں کرائیں۔ ان کے جہیز کا سامان اپنے پاس سے دیا۔ کوئی حاجت منداس کے دروازہ سے خالی نہ گیا۔

(نقوش لاہور، نمبر اول، محمد طفیل فروری 1962، 277)

محمد ہادی لکھتے ہیں کہ

"وہ تمام مصیبت زدہ افراد اور بے یار و مددگار لڑکیوں کی پناہ گاہ تھی۔ اپنے سولہ سالہ اقتدار کے زمانہ میں اس نے آٹھ سو لڑکیوں کی شادی اور جہیز کے اخراجات اور معمولی خیراتوں کی تعداد تقریباً بے شمار ہے۔"

(محمد ہادی (الیسٹ وڈروبن)، جلد ششم 99 اقبال نامہ 97)

قدرت نے اسے تیز فہمی عطا کی تھی۔ باریک بین نظر اور ہمہ گیر ذہن اور معقول سوجھ بوجھ، فطری صلاحیتوں کو تعلیم نے اور درخشاں کر دیا تھا۔ فارسی ادب میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ وہ صاف اور شستہ شعر کہتی تھی جس سے اسے اپنے شعور پر قابو پانے میں مدد ملی۔ وہ خود بھی ایک اچھی شاعرہ تھی اور شاعروں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتی تھی۔

مآثر الامراء کے مولف کا بیان ہے کہ نور جہاں کا تخلص مخفی تھا۔

(مآثر الامراء۔ ج 1، ص 134)۔ طلحہ علی نور تخلیق لکھتے ہیں (نامور مغل شہزادیاں 140ء) مفتاح التواریخ میں دو رباعیاں نور جہاں کی طرف منسوب ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

کشاد غنچہ اگر رند نسیم گلزار است
کلید قفل دل ما تبسم یار است
نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو نہ عارض و زلف
دل کسی کہ بحسن داد است گر گرفتارا

نور جہاں کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کے لطیفے بھی مشہور ہیں۔ ایک روز جہانگیر نے لباس تبدیل کیا جس کا تکمہ لعل بے بہا کا تھا نور جہاں نے اس کو دیکھتے ہوئے یہ شعر پڑھا

ترانہ تکمہ لعل است برقبای حریر
شدہ است قطرۂ خون منت گریباں گیر

جناب نذیر فتح پوری نے ماہنامہ 'اسباق' پونہ میں مغل شاعرات کا تذکرہ کیا ہے۔ جوہر دیو بندی نے اپنی تحقیقی کتاب 'نغمہ ناقوس' میں بادشاہ جہانگیر کی بیگم نور جہاں کے دو اردو اشعار شامل کیے ہیں حالانکہ یہ اردو کا ابتدائی زمانہ تھا ملاحظہ فرمائیں۔

دیں جگہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گے کچھ بھی وفا اس بت بیباک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جانِ عاشق
ترے قدموں سے جدا ہوئے ملے خاک میں ہم

('اسباق' پونہ، اکتوبر 2010، مارچ 2011 ص 92) (اردو کے ابتدائی دور کی چند شاعرات، از نذیر فتح پوری، پونہ)

نور جہاں نے جہانگیر سے 18 رسال بعد دسمبر 1645 میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس ملکہ کو اس کے تعمیر کردہ مقبرہ میں شاہدرہ میں ریلوے لائن کے متصل دفن کیا گیا۔ اس کی لوح مزار پر آج بھی یہ شعر نظر آتا ہے۔

بر مزار ما غریبان نی چراغی نی گلی
نی پر پروانہ سوزد نی صدای بلبلی

حوالہ جاتی واستفادہ کردہ کتب :

(1) نقوش لاہور نمبر اول۔ مدیر محمد طفیل، فروری 1962
(2) تزک جہانگیری۔ نور الدین جہانگیر بادشاہ 2007 (ترجمہ مولوی احمد علی صاحب رام پوری)
(3) تاریخ جہانگیری۔ ڈاکٹر بنی پرشاد۔ مترجم رحم علی الہاشمی 2006
(4) مغل شہزادیاں، علمی و ادبی خدمات۔ ڈاکٹر محمد فائق 2006۔ ناس بک۔ دہلی
(5) نامور مغل شہزادیاں۔ طلحہ علی۔ 2004۔ فرید بک ڈپو۔ نئی دہلی
(6) ہندوستان کی عظیم المرتبت اور معروف خواتین۔ ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، اورنگ آباد (مہاراشٹر) 2015
(7) بزم تیموریہ۔ جلد سوم۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ 2009 اعظم گڑھ
(8) ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ علی گڑھ۔ 2009

□□□

Dr. Abdul Aziz Irfan
Opp. Maulana Azad College
National Colony
Plot No. 34
Aurangabad-431001(M.S)

شاعرات کے منتخب اشعار

سورج نہ بن سکو تو شمع رہ گزر سہی
جینے کا اس جہاں میں کوئی مدعا تو ہو

گرمیِ غم سے پگھلتے نہیں ہمت والے
حسن تدبیر سے تقدیر بدل دیتے ہیں

مسعودہ حیات

زمیں کی ہم سخنی، قسمت صبا بھی نہیں
رہیں کہاں کہ یہاں معتبر ہوا بھی نہیں

غم و ملال کے آنگن میں پیر جلتے ہیں
جھلس کے جائیں کہاں کوئے بے ادا بھی نہیں

کشور ناہید

دکھ اور طرح کے ہیں عذاب اور طرح کے
اس راہ میں آئے ہیں سراب اور طرح کے

آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں خواب اور طرح کے
ہم لوگ کہ ہیں خانہ خراب اور طرح کے

صدیقہ شبنم

میرے افکار کے ہم زاد رہا کرتے ہیں
کتنا آباد مرا گوشۂ تنہائی ہے

عکس تا عکس بدل سکتی ہوں چہرہ میں بھی
میرا ماضی مگر آئینہ دکھاتا ہے مجھے

نور جہاں ثروت

ہنگامہ پسندی ہے نئے دور کی تقدیر
ہر لمحۂ خاموش مرے دل پہ گراں ہے

ٹھہرے ہوئے لوگوں کا کوئی ساتھ نہ دے گا
اے وقت گریزاں تیرے چہرے سے عیاں ہے

مظفر النساء ناز

عقل کی سو مسافتیں عشق کا ایک ہی قدم
فاصلہ فرش و عرش کا دل کا ایک گام ہے

موج تجلیات سے نور ہی نور ہے ہر طرف
کس کے فروغ حسن سے آج ضیائے عام ہے

اسما سعیدی

صحرا نشیں ہیں آج مگر کل چمن میں ہم
پھولوں کی آبرو تھے ذرا یاد کیجیے

رنگیں ہے جن کے خوں سے فضائے بہار گل
وہ سرفروش ہم تھے ذرا یاد کیجیے

سیما نظمی

پھر فضاؤں پہ خوف طاری ہے
اڑنے والوں کی یہ سزا تو نہیں

کوئی سایہ بھی صدا کا نہیں آہٹ تو کجا
صرف سناٹا ہر اک سمت بلاتا ہے مجھے

شائستہ یوسف

ڈاکٹر شمع پروین

اُردو کی خواتین تاریخی ناول نگار

ابتدا سے ہی ہندوستان گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں مختلف فنون لطیفہ کو فروغ حاصل ہوا۔ یہاں ادب، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان مختلف شعبہ علم کی نشونما کی سرزمین رہی ہے، جس میں ادب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور مختلف زبانوں کا اپنا ادبی سرمایہ ہے۔ یہاں کی مشہور زبانوں میں ایک زبان اُردو بھی ہے جس نے ہندوستان کی تہذیب وتمدن کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اُردو زبان کی تخلیقات میں ناول کی صنف خصوصی مطالعے کی مستحق ہے۔

ناول کو قصہ گوئی کا ہی ایک اسلوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جو انتہائی دلچسپ ہے کیونکہ دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں ناول کا کینوس کافی وسیع ہوتا ہے۔ یہ اپنے اندر کافی گہرائی اور وسعت رکھتا ہے، جس میں انسانی زندگی کی بھرپور عکاسی کی جاتی ہے۔ ناول میں انسان کے معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔

1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد حقیقت پسندی کا آغاز ہوا۔ یہ ہنگامہ خیز حالات ہندوستانیوں کے سیاسی، سماجی اور ادبی ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ حادثہ اپنے آپ میں ایک ایسا تاریخی موڑ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس حادثہ کا تعلق براہ راست سماجی وسیاسی تھا لیکن اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑا۔ زبان وادب بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکے۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی ''1857 کا تاریخی روزنامچہ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''1857 ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔''

(بحوالہ عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار از علی احمد فاطمی، طابع لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی، پہلا ایڈیشن، فروری 2007، ص 13)

اس زمانے میں سرسید کی اصلاحی تحریک نے معاشرتی زندگی کے طرزِ فکر اور انداز نظر میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کردی۔ اس کے زیر اثر زندگی کے مطالبوں کی تکمیل کا شوق پروان چڑھنے لگا اور معاشرتی حالات کے نشیب و فراز سے متعلق سختیوں، آزمائشوں اور محرومیوں کے مردانہ وار مقابلے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ناول کے اولین نمونوں کی شکل میں نذیر احمد کے نیم داستانی قصے منظر عام پر آئے۔ اسی دور میں اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد عبدالحلیم شرر نے ڈالی۔ اُن کا پہلا طبع زاد تاریخی ناول 1888 میں ''ملک العزیز ورجینا'' شائع ہوا۔

ناول کی طرح تاریخی ناول بھی اُردو ادب میں اپنے وجود کے لیے

انگریزی زبان وادب کا رہین منت ہے۔ 1857 کی غدر کی ناکامی نے مسلمانوں کی سیاسی انتشار، سیاسی طاقت اور اقتصادی بدحالی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور وہ اقتصادی بدحالی اور مایوسی کا شکار ہوگئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے مسلمانوں کی اس پست ہمتی اور مایوسی سے متاثر ہوکران کوتسلی دینے کی کوشش انھیں اپنے ماضی کی شاندار روایات کو یاد دلا کر کی۔ چنانچہ انھوں نے اسلامی تاریخ کی طرف توجہ دے کر اُردو میں تاریخی ناول کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین لکھتے ہیں:

''علوم صحیحہ کے میدان میں دیکھیے یا شعروادب کے یا فنون لطیفہ کے اگر اس دور میں کچھ کیا ہے توان ہندوستانیوں نے جن کے ذہن کی تربیت دراصل تہذیب مشرق کے ماحول میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے فلسفے اور مذہب، اپنے قانون اور رسم ورواج، اپنی تاریخ اور آثار قدیمہ پر دیسی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں کتابیں لکھیں۔''

(بحوالہ محمد علی طبیب حیات اور تصانیف از ڈاکٹر عبدالحئی، طباعت خواجہ پریس دہلی، اشاعت 1889، ص40)

تاریخی ناول لکھنے کی ابتدا ایک واضح نصب العین کے تحت ہوئی۔ تاریخی ناول نگاروں نے زندگی کے اضطراب و انتشار کو دور کرنے اور اجتماعی زندگی کوسکون ومسرت کا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اس سے بھی زیادہ انسانیت کے بلند اقدار کو محفوظ رکھنے کے خیال سے ان کے ذہنوں کو ان کے ماضی کی طرف منتقل کیا جس میں انسانی عمل انسانیت کی اقدار کا حامی ومددگار تھا۔ جہاں نیکی ہمیشہ کامیاب وکامراں اور بدی ہمیشہ مغلوب و ناکام ہوتی تھی۔ یہی درس عبدالحلیم شرر اور ان کے ہم عصروں نے تاریخی ناولوں کے ذریعہ عوام کو دیا۔ پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

''اُردو داں طبقہ شاید کچھ مدت کے لیے یہ بھول ہی گیا کہ ناول تاریخی ہونے کے علاوہ کچھ اور ہوسکتا ہے، جیسے ہماری معاشرتی اور مجلسی زندگی میں داستان کبھی تنہائیوں کی رفیق و دمساز اور مجلسوں اور محفلوں کا سرمایہ، سرور وانبساط تھی۔ اسی طرح تاریخی ناول موجودہ زندگی میں فرد و جماعت دونوں کی دلچسپی، دل بستگی اور اس سے بھی زیادہ ولولہ انگریزی و جگرسوزی کا وسیلہ بن گیا، آنکھوں میں ایک بار پھر سندھ و ہسپانیہ کے معرکوں اور غرناطہ وبغداد کے عظمت وشکوہ کے نقشے پھرنے لگے۔ مردہ دلوں کو پھر محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی... کی جانبازیاں زندگی کا پیام سنانے لگیں، تاریخی ناولوں کا مطالعہ فرصت کا سب سے محبوب مشغلہ بن گیا۔''

(اُردو ادب آزادی کے بعد از ڈاکٹر اعجاز حسین، اشاعت بار اوّل جنوری 1960، طابع عبدالمجید، اسرار کریمی پریس، الہ آبادی، ص265-264)

شرر نے تاریخی ناول نگاری کی جو تحریک چلائی اُس سے نہ صرف اُن کے ہم عصر ہی متاثر ہوئے بلکہ آنے والے زمانے میں بھی ناول نگاروں نے ان کے اثرات قبول کیے۔ تاریخی ناول نگاری سے متاثر ہونے والوں میں خواتین ناول نگار بھی ہیں۔ ان خواتین تاریخی ناول نگاروں میں جمیلہ ہاشمی، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے نام اہم ہیں۔ یہاں انھیں ناول نگاروں کے ناولوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

جمیلہ ہاشمی:

خواتین تاریخی ناول نگاروں میں سب سے پہلا نام جمیلہ ہاشمی کا آتا ہے۔ یہ اُردو کی اہم فکشن نگار ہیں۔ یہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ناول نویس بھی ہیں اوران کے اندر ایک زندہ شاعرہ کی روح ہے۔

''قرۃ العین حیدر کو تاریخ کی شاعرہ کہا جاتا ہے یہی بات جمیلہ ہاشمی پر بھی صادق آتی ہے۔''

(بہ صورت گر کچھ خوابوں کے (عصر حاضر کے 24 اہم ادیبوں کے انٹرویو) از طاہر مسعود، طابق عظیمی پرنٹرز ناظم آباد نمبر کراچی نمبر، بار اوّل، جنوری 1985، بار دوم ستمبر 1985، ص296)

ان کی اکثر تصنیفات میں ہمیں شاعری کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی قرۃ العین حیدر سے بہت متاثر تھیں اور ہوسکتا ہے کہ انھیں کے زیر اثر اپنے ناولوں میں تاریخی کرداروں کو موضوع بنایا ہو۔ ناول نگاری کے میدان میں جمیلہ ہاشمی 1950 کی دہائی میں اپنے پہلے ناول ''تلاشِ بہاراں'' کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔ دیکھا جائے تو ابتدا میں جمیلہ ہاشمی قرۃ العین حیدر سے بہت متاثر نظر آتی ہیں لیکن بعد کے دور میں ان کا اسلوب منفرد ہوتا چلا گیا۔ ان کا اسلوب شاعرانہ اور رومانی ہے جو انھیں دوسرے سے منفرد کرتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں اکثر تخیل، واقفیت پر غالب رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تخیلی باتوں کو یہ اصلی واقعات سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ دو چیزوں کو ایک مخصوص فاصلے سے دیکھتی ہیں۔ جس سے ان کی تحریر میں دھندلاہٹ، مدھم پن اور دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔ انھوں نے تاریخی موضوع پر دو ناول لکھے ہیں۔ دستِ سوس (1983) اور چہرہ بہ چہرہ روبہ رو (ناولٹ 1977)۔

چہرہ بہ چہرہ روبہ رو (ناولٹ 1977):

جمیلہ ہاشمی کا شمار اُردو کے اعلیٰ درجے کے ناول نگاروں میں ہوتا

ہے ان کے ناولوں میں فلسفہ، تصوّف کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ ناولٹ 1977 میں لکھا گیا۔ اس ناولٹ میں قرۃ العین طاہرہ المعروف بہ زریں تاج کی حیات زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ متصوفانہ کرداروں کو پیش کرنے میں مصنفہ کو خصوصی ملکہ حاصل ہے۔

ناول میں ایران کے متوسط طبقے کی پابندیوں اور محدود اخلاقی اقدار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں ایران کے شاہ قاچار کے زمانے میں پیدا ہونے والے بابی فرقے کے ایک اہم ستون قرۃ العین طاہرہ (اصل نام اُم سلمٰی) کی داستان بہت ہی خوبصورتی سے پیش کی گئی ہے۔ ناولٹ اُم سلمٰی کے اردگرد گھومتا ہے۔ اُم سلمٰی ناول کی ہیروئن ہے اور ایک مضطرب روح ہے، جس پر قدغن لگانے کی تمام کوششیں ناکام رہتی ہیں وہ حسین و جمیل ہونے کے ساتھ بہت ذہین بھی تھی۔ اس نے عام لڑکیوں کے برخلاف اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور گھریلو عورت کے دائرے سے نکل کر بابی عقیدے کے زیر اثر قرۃ العین طاہرہ بن جاتی ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر حساس ہونے کے ساتھ فلسفیانہ ذہن بھی رکھتی ہے۔ اس کی زندگی میں خوابوں کی بہت زیادہ معنویت ہے۔ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی، عالمہ اور شاعرہ ہے، اس لیے علم کی بنیاد پر خواب کی اکثر تعبیر تلاش کرتی رہتی ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

”جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس ناول میں ایک ایسی متنازعہ لیکن عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے جس کا نام آج تک خود ایک افسانہ ہے۔ اُم سلمٰی جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایک ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی، جو حق کی تلاش میں ساری زندگی سرگرداں رہی اور حق کی تلاش ہی میں جان دے دی۔ حق ہی اس کا محبوب تھا جس کے غمِ ہجر میں وہ ساری عمر تڑپتی رہی۔ آنکھیں جب محبوب کو دیکھنا چاہیں تو پھر کسی اور کو دیکھنے کی تمنا نہیں کرتیں۔ اس نے رسم پرست معاشرے میں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی وہ کام کیا جو ایرانی معاشرے میں اس وقت بہت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس نے فرسودہ قدروں کو تشکیک کی نظر سے دیکھا اور انھیں سوال بنا کر معاشرے کے شعور کو بیدار کردیا۔“

(معاصر ادبی، تنقیدی و فکری مضامین کا مجموعہ از ڈاکٹر جمیل جالبی، ص116)

ناول کو پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تاریخ زیادہ اور ناول کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اطلاعاتی مواد کے زیادہ استعمال نے واقعات کو مجروح کردیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ:

”ناول اقبال کے اشعار اور عزیز احمد کے افسانے زریں تاج سے متاثر لگتا ہے۔“

(برصغیر میں اردو ناول از ڈاکٹر محمد اشرف، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی، 2003، ص230)

ناول دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب مختصر ہے ناول کی ابتدا فیض احمد فیض کے اس شعر سے ہوتی ہے اور یہ شعر ہی قرۃ العین طاہرہ کی شخصیت کے اہم پہلو کو بیان کردیتا ہے۔

جس ڈھب سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

مصنفہ نے اس میں اپنے شاعرانہ نثر کا کمال پیش کیا ہے۔ سیاق و سباق کا شاعرانہ ماحول تشبیہات کو ندرت عطا کرتا ہے۔ ناول نگار نے تشبیہات واستعارات کا ناولٹ میں خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ پلاٹ میں روانی اور چستی ہے۔ پورا ناول اسلوبیاتی کیفیتوں کی خوبصورت مثال ہے۔ اس میں مصنفہ نے تصوّف، فلسفہ اور مذہبی علوم و اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ ناول کو پڑھ کر کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ قرۃ العین طاہرہ کی شخصیت کو پیش کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ قرۃ العین طاہرہ کے اندرون میں کسی کشمکش یا تصادم کا پتہ نہیں چلتا۔

دشتِ سوس (1983)

یہ ناول 1983 میں لکھا گیا۔ جمیلہ ہاشمی کو سب سے زیادہ مقبولیت اسی ناول سے ملی۔ ناول میں تاریخ اسلام کی ایک اہم شخصیت حسین ابن منصور حلاج کو موضوع بنایا گیا ہے، جو آٹھویں صدی عیسوی کے صوفی بزرگ تھے۔ اس کا پس منظر سلطنت عباسیہ کا زمانہ ہے جو اس دور میں زوال پذیر ہو چکی تھی۔ ناول میں ایک اچھے تاریخی ناول کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ اسے پراثر اور پرکیف بنانے میں غنائیہ تکنیک نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ انور سدید نے دشتِ سوس کو ایک تاریخی ناول بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”آرنلڈ بنٹ نے لکھا ہے کہ تاریخی ناول میں تخلیق کار تخیلی طور پر اس عہد کو تخلیق کرتا ہے جس میں اس نے زندگی نہیں گزاری۔ جمیلہ ہاشمی نے بھی منصور حلاج کے عہد کو اپنے تخیل کی معاونت سے حیات نو عطا کی۔“

(بحوالہ اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار از نیلم فرزانہ مطبع، ایم اے آفسیٹ پرنٹرز دہلی اشاعت 1992، ص273)

ناول کی ابتدا رومانوی پس منظر سے ہوتی ہے۔ کہانی تہذیب و

تمدن کی عکاسی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور المناک انجام پر ختم ہوتی ہے۔

''دشتِ سوس بغداد کا ایک علاقہ ہے جو اپنی مخصوص آب و ہوا کی وجہ سے اہم ہے۔ بیضا سے متصل دشت کا نام سوس ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی ریت زرد، سیاہ اور سرخ ہے۔ دشت سوس اپنی مخصوص فضا سے پورے ماحول پر چھایا ہوا ہے۔ یہ فضا حسین بن منصور حلاج کی روح کی خشکی کا استعارہ ہے۔

ناول نگار نے ناول کے روحانی سفر کی داستان کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے نغمۂ شوق، صدائے ساز اور رزمیۂ موت۔ اس کے پہلے حصّے میں حسین بن منصور حلاج کے روحانی ارتقا کی داستان بیان کی گئی ہے۔ دوسرا حصّہ کافی طویل ہے۔ تیسرے حصّے میں ہم نقطۂ عروج (climax) پر پہنچتے ہیں اور اس حصّے میں منصور سزائے موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔

ناول کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے جس سے تاریخ اور ناول دونوں ہم آہنگ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ناول کی فضا رومانی ہے اس لیے ناول تاریخی ہونے کے باوجود اپنی رومانیت کے سبب قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

ناول کے سبھی کردار تقریباً مقدرات کی باتیں کرتے ہیں چاہے وہ حسین ہو، اغول ہو، سہل بن عبداللہ تستری ہوں یا پھر حضرت جنید بغدادی ہوں، جس کی وجہ ناول میں جگہ جگہ مشیت اور مقدر کی باتیں ملتی ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار منصور حلاج ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی کردار ہے۔ خاموش دروں بیں، ماحول سے یکسر بیگانہ، جنسی کشش اور لذتوں سے کنارہ کش، اصول وضوابط کی پابندی میں سخت گیر، ایثار و قربانی کے جذبے سے مملو اور سرشار، ضبط و تحمل، قناعت و استغنا اور نفس کی گہرائیوں میں ڈوب جانے والا۔ ناول میں منصور جیسی تاریخی اور تہہ در تہہ پیچیدگیوں کی حامل شخصیت کو پیش کرنا معمولی کام نہیں تھا۔ کسی حقیقی شخصیت کو اس کی تمام نفسیاتی پیچیدگیوں اور ان سے پیدا ہونے والے انتشار کو کردار کے سانچے میں ڈھال کر ناول کے کینوس پر پورے تاریخی تناظر کے ساتھ پیش کرنا نہایت مشکل امر ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنے موضوع کی پیش کش میں فنی دربستگی اور تنظیم کا خیال رکھتے ہوئے اسے ایک دلچسپ ناول بنادیا ہے۔ ناول میں داستانوی عناصر کا استعمال کیا گیا ہے۔ ابتدا سے ہی ایک پیٹرن (pattern) بیان ہوا ہے جسے داستانی پیٹرن کا نام بخوبی دیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ دشتِ سوس ناول اپنی خوبیوں کے ساتھ اُردو ادب میں ایک اہم تاریخی ناول تسلیم کیا جاتا رہے گا۔ مصنفہ نے ناول میں دسویں صدی کے عباسی خلافت کے دور کو خوبصورت زبان و بیان کے پیرایہ میں دوبارہ زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

عصمت چغتائی:

عصمت چغتائی کا شمار اُردو ادب کی اہم خواتین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ عصمت چغتائی افسانوی ادب میں اپنی باغیانہ فطرت اور روایت شکن ذہن سے پہچانی جاتی ہیں اس کی وجہ ان کی گھریلو فضا اور ان کی حد سے زیادہ حساس فطرت کو قرار دیا جاتا ہے۔ عصمت کو ان کے سماجی حالات نے بہت زیادہ متاثر کیا اور انھیں حالات کی بدولت وہ حقیقت کی طرف مائل ہوئیں۔ عصمت اظہار کے معاملے میں حد سے زیادہ نڈر اور بے باک تھیں اس لیے انھوں نے اپنے خیالات بنا کسی تصنع و بناوٹ کے پیش کیے۔

عصمت چغتائی کو مارکس و فرائڈ کے نظریات اور ''انگارے'' کی افسانہ نگار رشید جہاں کے باغیانہ رجحان نے بہت متاثر کیا۔ یہ کمیونزم سے کافی متاثر تھیں اور ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہی ہیں۔

عصمت چغتائی کے اکثر ناولوں کے موضوع حقیقت پسندی، عورتوں کے نفسیاتی و جنسی مسائل وغیرہ ہیں۔ ان کا آخری ناول دوسرے ناولوں سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ ناول ''ایک قطرۂ خون'' میں عصمت چغتائی نے شہیدانِ کربلا کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس ناول کو عصمت کے عمومی میلانات سے ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے جو مذہب سے متعلق ہے۔ انھوں نے ناول ''ایک قطرۂ خون'' کے ذریعہ انسانیت کو پہلا اور مذہب کو دوسرا درجہ دیا ہے۔

ایک قطرۂ خون (1975):

عصمت چغتائی کا ناول 'ایک قطرۂ خون' (1975) میں منظر عام پر آیا۔ یہ ان کا آخری ناول ہے۔ اس میں شہیدانِ کربلا کی تاریخی داستان بیان کی گئی ہے جو اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ کربلا کے واقعات کو موضوع بنا کر تحریر کیے گئے ناولوں میں سب سے اہم خواجہ حسن نظامی کا 'طمانچہ بر رخسار یزید' ہے اور تقسیم کے بعد عصمت چغتائی نے 'ایک قطرۂ خون' تخلیق کر کے کربلا کے سلسلے کے ناولوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مصنفہ نے اس ناول کو 26 عنوانات میں تقسیم کیا ہے جو ترتیب وار اس طرح ہیں (1) طلوع، (2) بچپن، (3) پہلا غم، (4) علاج، (5) دوسرا غم، (6) تیسرا غم، (7) سراب، (8) حقیقت، (9) بلاوا، (10) سفر، (11) قافلہ، (12) کوفہ، (13) دو پھول، (14) راستہ میں، (15) ملاقات، (16) پہلا قدم، (17) دوسرا قدم، (18) آخری شمع، (19) آخری شب، (20) ایک قطرہ، (21) پیاسا پھول، (22) قصر

شیریں، (23) دربار، (24) ہند، (25) واپسی، (26) مجرم کون۔

'ایک قطرۂ خون' ناول تاریخی واقعہ پر مبنی ہے۔ ناول کے واقعات براہ راست تاریخ سے نہیں لئے گئے ہیں بلکہ اس کے پلاٹ کا زیادہ تر حصہ میر انیس کے مراثی سے لیا گیا ہے، جس کا اعتراف عصمت چغتائی نے خود کیا ہے۔ کہیں کہیں عصمت نے انیس و دبیر کے مشہور مرثیوں کے بند کو بھی نثر میں تحریر کر دیا ہے بلکہ مرثیہ کے تمام اجزا، چہرہ، رخصت، رجز، جنگ، شہادت اور بین بھی اسی انداز میں موجود ہیں۔ انھوں نے مذہبی عقیدوں اور روایتوں سے بھی کام لیا ہے۔ رسول خدا، امام حسن و حسین سے متعلق قصّے کو پیش کرنے کے لیے روایتوں سے استفادہ کیا ہے۔ ناول میں بیشتر حصّہ انیس کے مراثی سے مستعار ہے لیکن حضرت مسلم اور ایک خاتون کی محبت کا تذکرہ مصنفہ کی رنگ آمیزی ہے لیکن اس سے کردار کی اہمیت مجروح نہیں ہوتی۔

عصمت چغتائی کے ناول اکثر کسی نہ کسی پہلو سے پست سماج کی تعمیر کا حصّہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے 'ایک قطرۂ خون' ناول میں واقعہ کربلا کو موضوع بنایا ہے۔ واقعہ کربلا دنیا کی تاریخ میں نیکی، بدی، انصاف، ظلم و جبر اور زندہ رہنے کے حق کی سب سے بڑی جنگ تھی اور جس قربانی کا اثر آج چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی اسی طرح باقی ہے۔ عصمت اس موضوع سے بہت متاثر ہیں ناول کے پیش لفظ میں وہ رقمطراز ہیں:

''یہ اُن بہتر انسانوں کی کہانی ہے جنھوں نے انسانی حقوق کی خاطر سامراج سے ٹکر لی۔

یہ چودہ سو سال پرانی کہانی ہے کہ آج بھی انسان کا دشمن سے بڑا دشمن انسان کہلاتا ہے۔ آج بھی دنیا کے کسی کونے میں کوئی یزید سر اٹھاتا ہے تو حسینؑ بڑھ کر اس کی کلائی مروڑ دیتے ہیں آج بھی اجالا اندھیرے سے برسرِ پیکار ہے۔''

('ایک قطرۂ خون' از عصمت چغتائی، طباعت پارکھ آفسیٹ پرنٹنگ پریس ندوہ روڈ، لکھنؤ بار اوّل 1976، بار دوم 1999، ص 8)

کردار نگاری کے اعتبار سے مصنفہ نے مرد کرداروں کو پیش کرنے میں کوئی نئی بات پیش نہیں کی ہے۔ ان کے مرد کردار انیس کے بیان کردہ مرثیوں کی طرح ہی خودداری، شجاعت، صبر و قناعت اور حق پرستی کے پیکر ہیں۔ ناول میں مرد کرداروں سے زیادہ نسوانی کردار دلچسپ ہیں۔ ناول میں عورتیں اپنے مرتبے اور حالات کے مطابق باہمت، دلیر اور صابر دکھائی گئی ہیں۔

ناول میں منظر نگاری اور مکالمات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ منظر نگاری اور مکالمہ نگاری پر بھی انیس کے مرثیوں کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ مصنفہ ناولوں کے پلاٹ کی تشکیل میں اپنے فنکارانہ شعور کا بھرپور استعمال کرتی ہیں۔ ناولٹ کے پلاٹ میں ربط و تسلسل قائم ہے۔ ناول کے پلاٹ میں واقعات کا بے روک ٹوک بہاؤ اور فطری تسلسل ہے۔ ان کی زبان صاف ہے۔ 'پیاسا پھول' ناول کا (climax) نقطۂ عروج ہے۔ 'ایک قطرۂ خون' ناول عصمت چغتائی کے مخصوص اسلوب کی وجہ سے اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے اور ادبی حلقوں میں اس کی بہت اہمیت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

قرۃ العین حیدر کا شمار اُردو کے اعلیٰ پایہ کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جس دور میں اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا کی وہ عہد کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ سیاسی، معاشرتی اور اشتراکیت کے اعتبار سے یہ زمانہ کافی ہنگامہ خیز تھا۔ قرۃ العین حیدر نے ادب میں مختلف قسم کی حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی جسے 'تاریخی حقیقت نگاری' کا نام دیا گیا۔ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت تاریخی حقیقت نگاری پر بہت کم لوگوں نے قلم اُٹھایا تھا۔ انھوں نے صرف تاریخ کا ہی استعمال نہیں کیا بلکہ اس میں تخئیل کا عنصر شامل کر کے ناول کو خوبصورت بنانے کی کوشش کی۔ ان کے ناول رومانی تخئیل، تاریخی عناصر، نفسیاتی اور فلسفیانہ فکر، پُرخلوص مشاہدے اور نئے تجربات کا خوبصورت امتزاج ہیں۔ ان کے ناول 'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غمِ دل'، 'آخر شب کے ہم سفر'، 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'گردش رنگ چمن' وغیرہ ہیں لیکن تاریخی ناول کی حیثیت صرف 'آگ کا دریا' کو حاصل ہے۔ 'آگ کا دریا' ناول بھی نیم تاریخی ناول کے زمرے میں آتا ہے۔ ان کے دوسرے ناولوں میں تاریخی عناصر حد سے زیادہ پائے گئے ہیں۔

آگ کا دریا (1959):

قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' اُردو کا شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول 1959 میں منظر عام پر آیا۔ ناول 386 صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول اُردو کی عام روایت سے مختلف ایک ایسا ناول ہے جو ہندوستان کی قدیم تاریخ سے شروع ہو کر تقسیم کے بعد تک کے کچھ سالوں پر محیط ہے۔ اس میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال کی تہذیب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ناول میں ہندوستان کے پہلے راجا بمبسار سے لے کر 1956 تک کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تاریخی حقیقت نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر نیلم فرزانہ رقمطراز ہیں:

''قرۃ العین حیدر کا داستان طراز ذہن اسی تہذیبی زوال کو

موضوع قرار دیتا ہے جو بات قرۃ العین حیدر کو اپنے ماقبل اور ہم عصر فکشن نگاروں سے ممتاز و منفرد کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے ادیبوں نے جس طرح ماضی سے قطع نظر کر کے صرف حال کو اپنا مطمع نظر قرار دیا وہاں قرۃ العین حیدر نے ماضی کو ایک حقیقت تسلیم کیا اور اسے حال اور مستقبل سے اس طرح مربوط کیا کہ ان کی یہ کوشش اردو فکشن میں ایک اجتہادی کوشش بن گئی۔ اس طرح انھوں نے وقت کے تجربے (Time Experience) کو پہلی بار وسیع کینوس عطا کیا۔ قرۃ العین حیدر کے اس رویئے کو ہی میں نے تاریخی حقیقت نگاری سمجھا ہے۔''

(اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار از ڈاکٹر نیلم فرزانہ، ص 123)

'آگ کا دریا' کے ابتدائی حصے میں قدیم ہندوستان کے فکری دبستانوں کی تاریخ اور دوسرے سماجی اثرات کا بیان کیا گیا ہے۔ ویدک عہد سے ناول کی ابتدا ہوتی ہے اس کے بعد مغلیہ خاندان کے دور حکومت، مغلیہ سلطنت، انگریزی مداخلت اور پھر ملک کی تقسیم اور اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے پیچیدہ مسائل کو پیش کرتا ہے۔ ناول نگار نے ناول میں تاریخ اور تخیل کا خوبصورت امتزاج پیش کیا ہے۔ ناول تقسیم ہند کے المیہ واقعات کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں ہندوستانی کلچر کی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے اختتام کو پہنچتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول میں قدیم اور جدید تہذیب کی بھرپور عکاسی کی ہے اور وقت کے بہاؤ کو تاریخی اور فلسفیانہ شعور کے پس منظر میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے، جس سے قاری کے سامنے ماضی کی بازگشت اور حال کی کشمکش کی تصویریں آجاتی ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''یہ ناول صرف ہندوستان کی مخصوص تہذیبی زندگی، تاریخی ارتقا اور مختلف ادوار کی عام انسانی زندگی کی سطح سے بلند ہو کر ایک علامتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس ناول میں پہلی بار وقت اور موت کے ازلی اور ابدی مسئلے کو تخلیقی طور پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے ناول کے ابتدائی حصے میں اس مسئلے پر حد سے کسی قدر زیادہ ارتکاز کے باعث بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر ناول لکھنے کے بجائے فلسفے اور تاریخ کے میدان میں پہنچ گئی ہیں۔''

(اردو فکشن مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، مطبع لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ، سن اشاعت 1973، ص 115)

'آگ کا دریا' ناول میں منظر نگاری کی عمدہ مثال ملتی ہے۔ مصنفہ نے چندرگپت، چانکیہ، شاہ حسین مشرقی، شیر شاہ، ہمایوں، ایسٹ انڈیا کمپنی، برجیش قدر، غدر، رابندر ناتھ ٹیگور، راجہ رام موہن رائے، تقسیم ہند کا سانحہ، پاکستان کا قیام، ہندو مسلم فسادات سے متعلق واقعات کے موثر نمونے پیش کیے ہیں۔ منظر نگاری کے بیان میں رومانیت سے کام لیا گیا ہے۔ منظر نگاری تاریخی مقصدیت اور صداقت پر مبنی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''آگ کا دریا قرۃ العین حیدر کے اسی تصور اور اسی تکنیک کی نیم تاریخی نیم فلسفیانہ پیشکش ہے جو ان کے پہلے ناول کا خاصہ ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہاں اُنھوں نے ہندوستان کے ڈھائی ہزار سالہ تہذیبی تسلسل کی بازیافت میں عوامی قوتوں اور سماجی حقیقتوں کو نظرانداز نہیں کیا۔ تقسیم کے بعد والے حصے میں متحدہ قومیت، عوامی آزادی اور اشتراکی جمہوریت کے بارے میں کمال، چمپا احمد اور دوسرے کرداروں کے خوابوں کا طلسم جس طرح ٹوٹتا ہے اس کے بیان میں قرۃ العین کا دل دکھ، دردمندی اور انسان دوستی کے جذبات سے معمور نظر آتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے وقت کے بہاؤ، آواگون یا شعور کی رو کے تصورات سے کام لے کر زندگی کی ابھرتی پھیلتی اور ڈوبتی لہروں کو جیتے جاگتے کرداروں کی شکل میں، جس تخلیقی ہنر سے پیش کیا ہے وہ اردو میں فن کے ایک اچھوتے اور بے مثل نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب از پروفیسر قمر رئیس مطبع کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی، سن اشاعت 2004، ص 252-255)

مختصر یہ کہ اُردو ادب میں خواتین تاریخی ناول نگاروں کی تعداد بہت کم ہے لیکن جو بھی تاریخی ناول نگار ہمارے سامنے موجود ہیں اُنھوں نے نمائندہ کارنامے انجام دیے ہیں اور آئندہ آنے والے زمانے میں بھی خیر کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

□□□

Dr. Shama Parveen
Flat No. 203, 3rd Floor
Plot No. 118, Indirapuram
Ghaziabad-201014 (U.P)

ڈاکٹر شیویہ ترپاٹھی

جوگیا: رنگ و رومان

راجندر سنگھ بیدی کے شاہکار افسانوں میں سے ایک ''جوگیا'' نوجوان عشق کی رومانی داستان ہے۔جس کی معنوی پرتوں میں بقول وہاب اشرفی:

> ''بیدی ان کرچیوں کو چننے میں مصروف نظر آتے ہیں جن سے ہماری شخصیت لہولہان ہے......اور جب افسانہ تخلیق ہو جاتا ہے تو زندگی کی ناکامیاں اور محرومیاں ہمارے سامنے نئی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں''۔

جوگیا اس افسانے کی ہیروئن اور مرکزی کردار ہے اور اس کا عاشق جگل اس کہانی کا narrator۔ گرچہ کہ افسانے کا انجام عاشق ومعشوق کی جدائی پر ہے مگر اسے خالص رومانی المیوں کی قبیل میں شامل کرنا صحیح نہیں۔ اس افسانے میں غم کی وہ حبس، وہ جانکاہی کی کیفیت نہیں۔ نہ ہی ہفتوں تک قاری کی ذہن ودل کو کچوکے لگانے والے کرداروں کے دکھ۔ بیدی کے یہاں زندگی کی تحریک اور اثباتیت ہے اور اسی لیے ''جوگیا'' کے خاتمے پر قاری کو کچھ یاد رہ جاتا ہے تو بچھڑتے وقت حوصلہ مندی سے مسکراتے جوگیا اور جگل اور بے شمار رنگ۔

1960 کی دہائی میں ممبئی کی دادی شیٹ اگیاری لین میں رہنے والے دو نوجوان ہمسایوں کی محبت کا فسانہ ہے ''جوگیا''۔ اس محلے میں گجراتی، پنجابی، پارسی بھی رہتے ہیں اور جوگیا و اس کی ماں جیسے لوگ بھی جن کی سماجی شناخت مشکوک ہے۔ اہل محلہ میں وہی دائمی محبت و رقابت کا رشتہ ہے جو ہمارے یہاں ہمسایوں کے آپسی تعلقات کا خاصہ ہے۔ جگل ''گیان بھون'' میں رہتا ہے جہاں سے جوگیا کا مکان ''رنچھوڑ نواس'' صاف نظر آتا ہے۔ اتنا صاف کہ جوگیا کی الماری میں ٹنگی اس کی ساڑیاں اور ان کے رنگ ہمیشہ جگل کے حواس پر چھائے رہتے ہیں۔ جوگیا کی طرف کے مکانوں میں زیادہ تر اکیلی، بیوہ اور عورتیں رہتی ہیں۔ اسی لیے جگل ان مکانوں کو ''باپنو گھر'' کہتا ہے جو کہ ایک قسم کے shelter home کو کہتے ہیں۔ خاندانی لوگوں اور باپنو گھر کے مکانوں میں رہنے والوں کے درمیان ایک ان دیکھی خلیج سی ہے جہاں ایک دوسرے کے گھر آنا جانا، کھانا پینا تو رائج ہے مگر دل ہی دل میں انھیں حقیر و کمتر خیال کیا جاتا ہے۔

یہاں قطع نظر جگل کے غم اور غصے سے جو اپنے سماج پر طنز کی شکل میں ظاہر ہوا ہے وہ نکتہ ابھرتا ہے جو اس افسانے میں تصادم پیدا کرکے اسے نقطۂ عروج پر پہنچاتا ہے۔ یہ وہ سماج ہے جہاں شادی بیاہ جیسے رشتوں کے لیے تو افراد اور خاندانوں کا ہم پلہ ہونا ضروری ہے۔ خاندانی وضع داری اور پاکیزگی کے پس پردہ بہت کچھ رائج ہے۔

افسانے میں جوگیا اور جگل مرکزی کردار ہیں۔ ان کے علاوہ اگیاری کا پجاری، جگل کا دوست ہیمت، جگل کے بھائی، بھابھی اور بھتیجی ہیما، جوگیا کی ماں، محلے کے افراد (پنجابن، بجورکی ماں، ڈنکر بھائی) اور سکیشی ضمنی کردار ہیں۔ جگل گجراتی خاندان کا فرد ہے اور گجراتی خاصے

"جو گیا اور جگل کے علاوہ اس افسانے کے دیگر کرداروں میں جگل کی بھتیجی ہیما ہے جس کا معصوم بچپن ان دونوں کے عشق کو مزید پروان چڑھانے میں معاون ہے۔ "جوگیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی۔عجیب سہیلی پنا تھا............ہیما صرف سات سال کی تھی اور جو گیا اٹھارہ برس کی۔ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جسے صرف جو گیا جانتی تھی یا پھر میں جانتا تھا۔موٹے بھیا اور بھابھی صرف یہی سمجھتے تھے کہ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے۔اس لیے اسے پڑھانے آتی ہے"

روایت پسند ہوتے ہیں۔اس کے گھر میں اس کے بڑے بھائی، بھابھی، اور سات سال کی بھتیجی ہیما ہے۔وہ جے جے آرٹس اسکول کا طالب علم ہے اور ہر وقت رنگوں کی دنیا میں غرق رہتا ہے۔اس کے تمام اخراجات کا دارومدار اس کے بھائی پر ہے۔دوسری طرف جوگیا اپنی ماں کے ساتھ رنچھوڑ نواس میں رہتی ہے۔اس کی ولدیت کے متعلق طرح طرح کی باتیں محلے میں مشہور تھیں مگر جگل کی "اپنی تحقیق" یہ کہتی تھی کہ وہ مانا دور (کرناٹک) کے برہمن دیوان کی دوسری بیوی سے ہوئی اولاد تھی۔اس دوسری بیوی یعنی جوگیا کی ماں کو قانوناً بیوی کا درجہ نہیں مل سکا اور اس خوددار عورت نے دیوان صاحب کی داشتہ کہلانے کے بجائے مانا دور چھوڑ دینا بہتر سمجھا اور کپڑے سی کر بیٹی کی پرورش کرنے لگی۔جوگیا اپنے والد کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی۔نہ تو اسے اپنے والد کی شفقت نصیب ہوئی اور نہ ان کا نام۔اپنی ماں اور اپنے حالات سے اسے جو حاصل ہوا وہ تھا حوصلہ، بیباکی، آزادی اور تعلیم۔جوگیا سترہ اٹھارہ برس کی الہڑ خوش مزاج لڑکی ہے۔وہ عشق میں پیش قدمی کا حوصلہ بھی رکھتی ہے، خود کو بنانے سنوارنے میں بھی ماہر ہے، ہیما کے بہانے جگل کے گھر جانے کے راستے بھی تلاش لیتی ہے اور جگل کے عشق میں سرشار ہو کر اس کی پسند و ناپسند کو اپنے من میں اتار لیتی ہے۔اس کے اندر بچھڑنے سے قبل سرِعام عاشق کا بوسہ لے سکنے کی بے باکی بھی ہے اور بسترِ مرگ پر پڑی ماں کی خواہش کو اپنی آرزوؤں پر ترجیح دینے کی جذباتیت بھی۔جگل سے رخصت ہوتے وقت وہ نہ صرف خود کو سنبھالتی ہے بلکہ اسے بھی حوصلہ اور دلاسہ دیتی ہے۔جوگیا اس افسانے میں ایک الہڑ، ہنرمند، تعلیم یافتہ، بے باک مگر جذباتی لڑکی کے روپ میں ابھرتی ہے۔

جوگیا کے برعکس جگل زیادہ سنبھلی ہوئی کیفیتوں اور پختہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔جوگیا کے عشق میں سرشار ہونے کے باوجود اس کے کردار میں وہ طغیانی جذبات اور طوفان احساسات نظر نہیں آتا جو کم عمری کی نشانی ہے۔اس کے لیے ساری دنیا جوگیا کے رنگ میں رنگی ہے اور ایک آرٹسٹ ہونے کے ناتے وہ جوگیا کے پیرہن میں شامل رنگوں میں خاصی دلچسپی لیتا ہے۔ہر رنگ کے کیف و کوائف اس پر الگ طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔اسے اپنے گھر میں جوگیا سے اپنے رشتے کی ناپسندیدگی کا بھی احساس ہے اور جوگیا کی ماں کی بے بسی اور جوگیا کی سپردگی کا بھی۔وہ جوگیا کے ساتھ فٹ پاتھ پر بھی رہنے کو تیار ہے اور جوگیا کی ماں کی بیزاری اور ناراضگی کو بھی سمجھتا ہے۔جوگیا اپنی ماں کی ضد کے سامنے جھکتی نظر آتی ہے اور یہ اس کے کردار کا تضاد ہے کہ اس کی تمام بے باکی اور جگل کے لیے اس کی سپردگی ماں کی جذباتی دھمکیوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔افسانہ اس وقت زیادہ ڈرامائی ہو جاتا ہے جب جوگیا کی ماں کپڑوں میں تیل چھڑک کر جل کر مرنے کی دھمکی دیتی ہے۔بیدی فلمی دنیا سے بہت وقت تک جڑے رہے۔ان کے افسانوں پر کئی فلمیں بنیں اور کئی فلموں کی اسکرپٹ اور مکالمے انھوں نے لکھے۔اس مقام پر "جوگیا" اسی فلمی ڈرامائیت سے متاثر نظر آتا ہے۔

جوگیا اور جگل کے علاوہ اس افسانے کے دیگر کرداروں میں جگل کی بھتیجی ہیما ہے جس کا معصوم بچپن ان دونوں کے عشق کو مزید پروان چڑھانے میں معاون ہے۔"جوگیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی۔عجیب سہیلی پنا تھا............ہیما صرف سات سال کی تھی اور جوگیا اٹھارہ برس کی۔ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جسے صرف جوگیا جانتی تھی یا پھر میں جانتا تھا۔موٹے بھیا اور بھابھی صرف یہی سمجھتے تھے کہ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے۔اس لیے اسے پڑھانے آتی ہے۔" اگیاری کا پارسی پجاری بھی جگل اور جوگیا کے سفرِ عشق کا شاہد ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دونوں اسے ہر روز "صاحب جی" کہنا نہیں بھولتے۔جگل کے الفاظ میں۔"ہم گھر سے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی اگیاری کے پاس مل جاتے تھے۔ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پجاری ہی جانتا تھا جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر بیٹھا ہوتا اور منہ میں

ڈنڈا وستا پڑھتا رہتا تھا۔ وہ صرف ہمارے سروش کو سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم اسے ضرور ''صاحب جی'' کہتے ....'' جنگل کے گھر والے، جوگیا کی ماں اور محلے کی عورتیں ضمنی کردار ہیں جو اس ماحول کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں جو اس داستان محبت میں رخنہ ڈالنے والا ہے۔ دونوں مرکزی کرداروں کے علاوہ اس افسانے میں تیسرا جاندار کردار ابھرتا ہے ہیمنت کا۔ بقول جنگل:

''ہیمنت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں بسنت تھا..... بہار جو اس پر ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔'' دنیا بھر میں کہیں، کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے، لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک سی ہی ہنسی رہتی تھی۔''

ہیمنت جنگل کا دوست اور ہم جماعت ہے مگر اس کی فطرت آرٹسٹوں کی مانند رومان و غم کے خمیر سے تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ جب جنگل اپنے خیالوں کی دنیا میں حد سے آگے نکل جاتا ہے ہیمنت ہی اس کی واپسی کا سبب بنتا ہے۔ وہ جنگل کا مذاق بناتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر سے رومان کی پٹی اتار پھینکتا ہے اور اس کا کان پکڑ کر رنگوں کے حصار سے باہر لاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیدی نے جنگل کی anti image کے طور پر ہیمنت کا کردار گڑھا ہے اور اس کے توسط سے زندگی کی حقیقتوں سے جنگل کا رشتہ استوار کیا ہے۔ ''میں ہیمنت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جبکہ سب عورتیں سرمئی ساڑیاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں۔ مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے۔ لیکن جب ہیمنت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا تو مجھے وہ الگ الگ دکھائی دینے لگتے۔'' ہیمنت سکیشی میں دلچسپی رکھتا ہے جو اپنی وضع قطع میں جوگیا کی ضد ہے وہ فیشن میں عریانی کی حدوں تک پہنچ کر روز بروز ماڈل بنتی جارہی ہے۔ افسانے کے یہ تمام کردار اپنی چال ڈھال، فکر و خیال اور طور طریقوں میں حقیقی و قابل قبول ہیں۔

بیدی کے قلم کے ذریعہ قاری دادی سیٹ اگیاری لین، جے جے آرٹس اسکول، جہاں گیر آرٹ گیلری، میٹرو سنیما، کرافورڈ مارکیٹ، وکٹوریا ٹرمنس اور ہاربنی روڈ پر جنگل و جوگیا کے ہم قدم سفر کرتے ہوئے خود کو اس داستان عشق کا ہی حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ افسانہ ہم جنگل کی زبان سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک تو داستان عشق بہ زبانِ عاشق اور دوسرے عاشق بھی فنکار اور رنگوں کا شیدائی:

''رنگ میرے حواس پر چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد و عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ اکثر بے معنی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔'' غرض یہ کہ جوگیا میں رنگ اور رومان کا حسین امتزاج ہے۔ رنگ اس افسانے میں آلۂ فن بھی ہے اور پس منظر بھی۔ یہ رنگ افسانے کے مختلف فریم بھی تخلیق کرتے ہیں اور افسانے کی معنویت کا دارومدار بھی انھیں رنگوں پر ہے۔ بیدی جب ان رنگوں کا ذکر چھیڑتے ہیں تو ان کے سارے لوازمات پر ایک ماہر آرٹ کی سی نظر ڈالتے ہیں۔ ان کا قلم نہایت باریکی سے رنگ اور انسانی فطرت پر ان کے اثرات کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ جوگیا کی ساڑیوں کے مختلف رنگ اور combinations ایک طرف تو اس کی ہنرمندی کی دلیل ہے:

''جوگیا یوں بڑی بھولی تھی لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی۔ کب اور کس وقت کیا کرنا ہے وہ خوب جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔'' تو دوسری طرف ایک آرٹسٹ (جنگل) کے طرز فکر، احساسات و خیالات کو بھی واضح کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور ساتھ ہی ایک حساس قاری کی جمالیاتی حس و شعور کو بھی برانگیختہ کرتے ہیں۔ یہ رنگ دن رات، صبح و شام، سرد گرم کا بھی احاطہ کرتے ہیں، بدلتے موسموں کے بھی ہم قدم نظر آتے ہیں اور جوگیا و جنگل کی محبت کے نشیب و فراز میں ان کے ہمنوا و ترجمان بن کر ابھرتے ہیں۔ گوشت پوست کے انسانوں سے پرے اس افسانے میں رنگوں کا بھی بہت اہم رول ہے بلکہ یہ رنگ ہی سب سے حاوی کردار ہیں۔ تجسس ہوتا ہے کہ افسانے کا عنوان ''جوگیا'' رکھتے وقت بیدی کے ذہن میں کیا صرف افسانے کی ہیروئن اور مرکزی کردار تھی؟ یا پھر جوگیا رنگ ان کے ذہن میں تھا جسے عام طور پر ترک دنیا کرنے والے زیب تن کرتے ہیں یا پھر یہ جوگیا خود جنگل ہے جو اپنی معشوقہ کے عشق میں بےخود ہو کر تمام دنیا کو بھول چکا ہے اور جسے ساری دنیا ''اپنی جوگیا'' کے رنگ میں ہی رنگی نظر آتی ہے؟ یا یہ تینوں معنی ہی بیدی کے ذہن میں تھے؟ منٹو نے ایک دفعہ بیدی سے کہا تھا: ''بیدی تمھاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔'' یہ رائے بالکل درست ہے بلکہ بیدی اپنے قاری کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور وہ معنی کی پرتوں کو کھولنے کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے۔

رنگ اپنے تمام انواع و اقسام کے ساتھ اس افسانے میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ یہ رنگ سفید، سیاہ، سبز، سرخ، دھانی، فیروزی، کاسنی، گلناری، مولسری، چمپئی، سرمئی، اودے، خاکستری، گلابی بھی ہیں اور خوشی و اداسی کے بھی۔ ہر رنگ کی اپنی انفرادی کیفیت و تاثیر ہے اور بیدی

ایک ماہر رنگ شناس کی طرح ان سے بھر پور کام لیتے ہیں۔ مثلاً جوگیا کا پہلی مرتبہ بوسہ لینے کے بعد جنگل کو خیال آتا ہے:

''اس دن اگر ہم جو شیلے، گہرے سرخ رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جوگیا کا منھ نہ چوم سکتا تھا۔''

سرخ رنگ خواہش، جوش، ولولے اور خون کے ابال کی علامت ہے۔ اسی طرح جوگیا رنگ بیراگ یا ترک دنیا کی علامت ہے جس کا استعمال جوگیا کی اداسی اور شکستگی کے پس منظر کے طور پر کیا گیا ہے:

''میں اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں سب عورتوں نے جوگیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ انھیں کس نے بتایا تھا؟ وہ اداس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انھیں بھی کوئی بیراگ ہو گیا تھا......ان سب نے بیراگ پالیا تھا اور جوگیا کفنیاں پہنے، بلا ارادہ، بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے۔''

گلابی رنگ عشق وخمار، رومان ونزاکت کی علامت ہے۔ اسی لیے آخری رخصت کے وقت بیدی جوگیا کو گلابی ساڑی اور بالوں میں گلاب کا ہی پھول لگائے portray کرتے ہیں تاکہ جنگل اسے ہمیشہ اسی روپ میں یاد رکھے۔ خوبصورت گلابی ساڑی میں مسکراتی جوگیا نہ صرف جنگل کے دل میں ایک حسین یاد بن کر محفوظ ہو جانا چاہتی ہے بلکہ قاری کے ذہن پر بھی درد وغم کے بجائے رومانویت کا دیرپا تاثر قائم کرتی ہے۔ قاری کے ذہن پر محبت کی ابدیت وآفاقیت کا نقش قائم ہو جاتا ہے۔ یہ رنگ جنگل کے جذبات کو اس وقت متانت اور معنویت عطا کرتے ہیں جب جوگیا سے پہلی قربت کے بعد وہ جذباتیت کے عالم میں سوچتا ہے:

''دنیا کی سب چیزیں اس روز اجلی اجلی دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اودا، سفید، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں آیا، ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی جمع تفریق میں نہیں آتا اور جسے اجلا کہتے ہیں۔ جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوتے ہیں۔''

جب رشتے سے انکار کے بعد جوگیا نے گھر سے نکلنا بند کر دیا اور جنگل اس کی صورت تک کو ترس گیا اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کی عکاسی میں بیدی رنگ کو ہی آلہ بناتے ہیں:

'ایسی شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا۔ ان کا صرف ایک ہی رنگ ہوتا ہے جس اور جانکاہی کا رنگ

''رنگ اپنے تمام انواع واقسام کے ساتھ اس افسانے میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ یہ رنگ سفید، سیاہ، سبز، سرخ، دھانی، فیروزی، کاسنی، گلناری، مولسری، چمپئی، سرمئی، اودے، خاکستری، گلابی بھی ہیں اور خوشی و اداسی کے بھی۔ ہر رنگ کی اپنی انفرادی کیفیت وتاثیر ہے اور بیدی ایک ماہر رنگ شناس کی طرح ان سے بھر پور کام لیتے ہیں''

......اتنی گھٹن، اتنی اداسی۔ اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔ میلا میلا، چھدرا چھدرا، جیسے منھ میں ریت کے بے شمار ذرے اور پھر اس میں ایک عفونت ہوتی ہے جس سے متلی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی ہے۔ آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔''

اس افسانے میں سب سے لطیف اور پر پیچ مسئلہ یہ ہے کہ جوگیا جس رنگ کی ساڑی پہنتی ہے جنگل کو دنیا کی تمام عورتیں اسی رنگ یا اس کے combination کے لباس میں نظر آتی ہیں:

''یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی سب عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساڑی۔ اسکرٹ بھی دھانی تھے اور میں سوچتا رہ گیا تھا.........''

ہمت اس کیفیت کو ساون کے اندھے کی حالت سمجھتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جنگل کے حواس پر جوگیا اس قدر چھائی ہے کہ اس کی ذات لاشعوری طور پر اس کے فکر وخیال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آرٹسٹ ہونے کے سبب جنگل کے لیے جوگیا کے پیرہن کے رنگ اس کے وجود کا سب سے دلچسپ حصہ ہیں۔ ان رنگوں کو وہ اتنی شدت سے سوچتا اور محسوس کرتا ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ رنگ موجود ہوتا ہے لاشعوری طور پر جنگل کی توجہ کھینچ لیتا ہے۔ جذبات کی شدت میں جوں جوں اضافہ ہوتا ہے جنگل کے ذہن سے رنگوں کا فرق مٹنے لگتا ہے۔ اسے ہر رنگ میں صرف وہی رنگ نظر آتا ہے جو

کہ اس روز جوگیا نے زیب تن کیا ہو:

''میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔وہ جوگیا کپڑے پہنے کمنڈل لیے جا رہی تھی۔ہیمنت کھلکھلا کے ہنسا........ہنسی تھمی تو اس نے کہا،''تو بالکل پاگل ہو گیا ہے جنگل.......کہاں ہیں جوگیا کپڑے؟اس عورت نے تو ایک اودی ساڑی پہن رکھی ہے اور وہ کمنڈل جو تجھے دکھائی دیتا ہے،ایک خوبصورت پرس ہے۔''

غرض یہ کہ جیسے جیسے عشق سر چڑھتا ہے جنگل کا مرض بھی بڑھتا جاتا ہے۔

اس افسانے میں تصادم کی صورت اس وقت پیش آتی ہے جب سماجی بندشوں کے سبب جنگل کے لیے جوگیا کا رشتہ ٹھکرا دیا جاتا ہے۔جنگل کے گھر والوں کے لیے یہ رشتہ قابل قبول نہیں کیوں کہ نہ جوگیا کے والد کے متعلق وثوق سے کچھ پتہ تھا اور نہ اس کی ماں اسے جہیز میں کچھ خاص دے دلا سکتی تھی۔جنگل حالانکہ اپنے اخراجات کے لیے اپنے بھائی کے آسرے پر ہے مگر پھر بھی وہ سب سے الگ ہو کر جوگیا کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے تیار ہے۔پر اب جوگیا کی ماں اس رشتے کے لیے تیار نہیں۔وہ غیرت مند عورت اب جنگل کی صورت سے بھی بیزار ہو چکی ہے اور اپنی بیماری کے سبب جلد از جلد''جوگیا کا ہاتھ کسی واجبی گزارے والے مرد کے ہاتھ میں''دے دینا چاہتی ہے۔آخر کار وہ بڑودہ میں جوگیا کا رشتہ طے کر دیتی ہے اور ماں بیٹی ہمیشہ کے لیے ممبئی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

کرداروں کے داخلی تصادم پر نظر ڈالیں تو جنگل اپنی بے سروسامانی،بے روزگاری اور جوگیا کی محبت کے درمیان تھوڑی دیر کو الجھتا ہے اور پھر ثابت قدمی کے ساتھ اپنی محبت کے حق میں فیصلہ لیتا ہے۔جوگیا کی اندرونی کشمکش زیادہ شدید ہے کیونکہ وہ اپنی ماں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔جنگل کی محبت اور ماں کی خواہش میں جو تصادم ہے وہ جوگیا کے کردار میں داخلی تناؤ پیدا کرتا ہے۔اس صورت حال میں ہمارے معاشرے کی زیادہ تر لڑکیاں والدین کے حق میں فیصلہ لیتی ہیں اور یہی جوگیا نے کیا۔اب تک افسانے میں جو اس کا بیباک کردار ابھرتا ہے وہ ماں کی علالت کے سامنے ایک عام جذباتی لڑکی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔وہ ماں کی خواہش کا احترام کرتی ہے اور فیصلے پر پہنچنے کے بعد پھر اسی حوصلہ مندی و بیباکی کا مظاہرہ کرتی ہے۔جنگل سے آخری دفعہ ملنے وہ آرٹسٹ اسکول جا پہنچتی ہے۔

اب جب جنگل ہی اس سے جدا ہو رہا ہے تو اسے نہ لوگوں کا خوف ہے اور نہ حالات کا۔وہ جنگل کو اپنے ہی انداز میں صبر کرنے کی،حوصلہ کرنے کی تلقین کرتی ہے:

جوگیا کی اندرونی کشمکش زیادہ شدید ہے کیونکہ وہ اپنی ماں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی .جنگل کی محبت اور ماں کی خواہش میں جو تصادم ہے وہ جوگیا کے کردار میں داخلی تناؤپیدا کرتا ہے .اس صورت حال میں ہمارے معاشرے کی زیادہ تر لڑکیاں والدین کے حق میں فیصلہ لیتی ہیں اور یہی جوگیا نے کیا

''میرے جانے کے بعد تم روئے تو میں تمھیں ماروں گی،ہاں۔''

اور ساتھ ہی اس نے مجھے مکا دکھایا۔''وہ نہیں چاہتی کہ اس کے دل میں جوگیا کی رنجیدہ و غمزدہ تصویر باقی رہ جائے اس لیے محلے سے رخصت ہوتے وقت وہ گلابی رنگ کی ساڑی میں نہایت خوبصورتی سے آراستہ ہوتی ہے۔اس موقعے پر وہ نہایت حوصلہ مندی سے مسکراتی ہے اور اس کا یہ تبسم جنگل کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔دونوں کو ساتھ کھڑے دیکھ کر ادھر سے گزرتا پارسی پجاری ہاتھ اٹھا کر انھیں آشیرواد دیتا ہے۔افسانہ یہیں اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور قاری اسے بار بار سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوگیا اور جنگل کی محبت لافانی اور لازوال ہو گئی ہے۔ان کے عشق کی ابدیت اور آفاقیت قاری کے ذہن و دل پر حاوی ہو جاتی ہے۔ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ان کی شکست خوردگی کی دلیل نہیں بلکہ وہ دونوں بچھڑ کر بھی ایک نظر آتے ہیں۔دونوں نے ایک دوسرے کو روحانی،ذہنی و جذباتی سپردگی کی انتہا کو پا لیا ہے اور اب انھیں اطمینان ہے کہ دونوں اپنا''آپا''کسی اور کو سونپ سکنے کی حالت میں نہیں۔ان کی روحیں ایک ہو چکی ہیں اور اب دنیا کی کوئی شے ان کے درمیان حائل نہیں۔اس نکتے کا سراغ افسانے کے شروعاتی صفحوں میں ہی مل جاتا ہے جہاں جوگیا سے پہلی مرتبہ قریب ہونے کے بعد جنگل کہتا ہے:

''میرا گلا تشکر کے احساس سے رندھا ہوا تھا۔میں کس کا شکریہ ادا کر رہا تھا؟اس ایک لمس سے جوگیا ہمیشہ کے لیے میری ہو گئی تھی۔میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔اب وہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی،کسی کے ساتھ سو بھی جاتی،جب بھی وہ میری تھی۔ایسا چھن جس میں سچائی ہو،ولولہ ہو،بدنصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے؟''

بیدی کے مخصوص نرم لہجے میں یہ افسانہ اپنے اندر عشق کے تمام پہلوؤں ہجر و وصال، شادکامی و نامرادی، روح و جنس، حقیقت و رومان کو سمیٹے ہوئے ہے۔ بقول وہاب اشرفی ”بیدی کے افسانوں کا محور جنس اور غم ہے۔“ یہ افسانہ بھی جنسی ارتعاشات سے عاری نہیں جنگل اور جوگیا کی محبت کوئی افلاطونی عشق (platonic love) نہیں بلکہ یہ مرد اور عورت کی وہی فطری و جبلی محبت ہے جو بیدی کے الفاظ میں ”مقدس اور غلیظ“ ہے۔ جنس کی زیریں لہریں افسانے میں ہر جگہ رواں دواں ہیں مگر یہ روح و جذبے پر کہیں بھی حاوی نہیں ہوتیں۔ چند مثالیں:

جنسیات کو برتنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ بیدی رکاکتوں سے دامن آلودہ کیے بغیر اس موضوع کو نبھانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ افسانہ بیدی کے آخری دور کے افسانوں میں شمار ہوتا ہے اور اس میں جنسی لوازمات کا بیان قدرے تفصیل سے ہے مگر پھر بھی افسانے کے پلاٹ میں یہ مرد اور عورت کے رشتے کی نزاکت، لطافت، نفسیاتی اور جبلی حقیقت کو ہی واضح کرتا ہے نہ کہ غیر ضروری لذتیت کا باعث بنتا ہے۔

بیدی ماہر نفسیات ہیں۔ عورتوں کی فطرت و مزاج کے متعلق جنگل کی زبان سے بیدی نے جو لطیف اشارے کیے ہیں ان کا بدل ملنا مشکل ہے۔ مثلاً::

☆اگر پیار کی باتیں ہوتی بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور پھر اس بات پر کڑھتی کہ اس کے بغیر بھی گزارا نہیں۔

☆ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پراسرار ہے اور پرپیچ۔ اتنا بھید، اتنا رہسیہ کہ مرد اس کی تھاہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سنا ہے چاند نہ صرف عورت کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں۔ روشنی ہی نہیں۔ وہ تو سب سورج سے مستعار لیتا ہے...... جبھی ساڑی پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے۔ آج کون سی ساڑی پہنوں؟

☆”جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟“

”کیا...... کیا...... کیا......“؟ میں نے بے صبری سے پوچھا

”چاہتا ہے“ اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”تمھیں اس میں چھپا کر ان امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے آپ ہی واپس آؤں۔ نہ تمھیں آنے دوں۔“

☆”ایسے ہی...... کبھی کبھی تمھارا من میرے من میں آ جاتا ہے۔“

☆اسے کتنی جلدی تھی لڑکی سے عورت بن جانے کی اور پھر عورت سے ماں ہو جانے کی۔

☆اس کی آنکھیں میلوں اندر دھنس گئیں اور نمی سی باہر جھلکنے لگی۔ میں سمجھ گیا، جوگیا بیحد جذباتی لڑکی ہے۔ بھلا میرے سامنے اتنی ممنون دکھائی دینے کی کیا ضرورت تھی! لیکن بات دوسری تھی۔ جس رنگ کی میں لپسٹک لایا تھا اس سے میچ کرتی ہوئی ساڑی جوگیا کے پاس نہ تھی نہ خریدنے کے لیے پیسے تھے۔

محبت کی اضطراری کیفیتوں، عشق کے داؤں گھات اور نوجوان دلوں کی دھڑکنوں کو ضبط تحریر میں لانے میں بھی بیدی نے فنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ بقول وہاب اشرفی:

”بیدی نے رومانی کہانیاں کم لکھی ہیں، اس لیے کہ ایسے موضوعات کو برتنے کے لیے جوانی کی امنگیں چاہیے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ جب انھوں نے بھولے بھٹکے اس سبجیکٹ کی طرف رجوع کیا تو ایک خاص انداز سے۔ یہ انداز lyrical ہے۔“

چند مثالیں پیش ہیں:

☆جوگیا کو دیکھتے ہی میرے اندر دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جوگیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی۔

☆محبت میں ایک قدم بھی بعض اوقات سیکڑوں فرسنگ ہوتا ہے اور آدمی چلنے سے پہلے تھک جاتا ہے۔

☆ہم دونوں کے اکیلے پن نے سارے ہال کو بھر دیا۔

☆ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی اگیاری کے پاس مل جاتے تھے...... معلوم ہوتا تھا، اگیاری تک یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں۔ اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

☆مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت مند لڑکی کے جب بچے پیدا ہوں گے، جڑواں ہوں گے بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں، میں انھیں کیسے سنبھالوں گا؟ اور اس خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

☆جانتی ہو جوگیا! آج تم کیا لگتی ہو؟“

”کیا لگتی ہوں؟“

”بیر بہوٹی...... جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے۔“

جوگیا کے دل میں کوئی شرارت آئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”جانتے ہو تم کون ہو؟“

”؟“

''پیر......اور میں پیر بہوٹی۔''

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے کے رنگ اور ساڑی کے رنگوں میں ذرا سا بھی فرق نہ رہا۔''

''جوگیا'' میں رنگ و رومان کی حسین آمیزش سے ایسے شیڈس پیدا ہو گئے ہیں جو آنکھوں کے سامنے لہراتے ہیں مگر ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔

افسانے کی زبان پر اس ماحول کا صاف اثر ہے جس کے پس منظر اور فریم میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ گجراتی خاندان کے جنگل کے مرکزی کردار ہونے کے سبب موٹے بھیا باپنو گھر جیسے ایک آدھ لفظ لا کر اس فضا کی صداقت کو بنائے رکھا گیا ہے۔ پارسی پجاری، اگیاری، ڈنکر بھائی، پرنسپل سابری اور ''صاحب جی'' جیسے طریق آداب سے داری شیٹ اگیاری لین کی پارسی فضا کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیدی کی زبان کا کھردرا پن اور ناہمواری ایسے رومانی و نرم افسانے میں بھی واضح ہے۔ یہ زبان ان کی فطری اپج ہے اور وہ ماحول و کردار کے مطابق الفاظ اور محاوروں کو اپنے منفرد انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے فن میں استعاروں، تشبیہوں اور مماثلتوں کی بھرمار ہے۔ ان کی زبان و انداز بیان تخلیقی ہے اور اس میں معنی کی سیکڑوں پرتیں پوشیدہ ہیں۔ مثلاً:۔

☆ جوگیا کا چہرہ سومناتھ مندر کے پیش رخ کی طرح چوڑا تھا جس میں قندیل جیسی آنکھیں، رات کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں۔

☆ اس کا چہرہ کیا تھا، پورا تارا منڈل تھا، جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔

☆ اس دن بہت گرمی تھی۔ نیچے دادی سیٹ اگیاری لین میں آتے جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گزرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا، موسم کی بھٹیارن کہیں دانے بھون رہی ہے۔ جب کوئی پنجابی یا مارواڑی بڑا سا پگڑ باندھے آتا تو اوپر سے بالکل مکی کا دانا معلوم ہوتا جو بھٹی کی آنچ میں پھول کر سفید ہو جاتا ہے۔

☆ جبھی ہی میں نے دیکھا خنک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے۔

☆ ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پکڑ کر اس سے لپسٹک لگانے کی اجازت بھی لے چکی تھی۔ ایک طرف زندگی دھیرے، دھیرے بجھی جا رہی تھی اور دوسری طرف لپک لپک کر کھل رہی تھی۔

☆ سرِ شام ہی چمگادڑ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر سمٹنے لگے۔

''افسانے کی زبان پر اس ماحول کا صاف اثر ہے جس کے پس منظر اور فریم میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ گجراتی خاندان کے جنگل کے مرکزی کردار ہونے کے سبب موٹے بھیا باپنو گھر جیسے ایک آدھ لفظ لا کر اس فضا کی صداقت کو بنائے رکھا گیا ہے۔ پارسی پجاری، اگیاری، ڈنکر بھائی، پرنسپل سابری اور ''صاحب جی'' جیسے طریق آداب سے داری شیٹ اگیاری لین کی پارسی فضا کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیدی کی زبان کا کھردرا پن اور ناہمواری ایسے رومانی و نرم افسانے میں بھی واضح ہے۔ یہ زبان ان کی فطری اپج ہے اور وہ ماحول و کردار کے مطابق الفاظ اور محاوروں کو اپنے منفرد انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے فن میں استعاروں، تشبیہوں اور مماثلتوں کی بھرمار ہے۔ ان کی زبان و انداز بیان تخلیقی ہے اور اس میں معنی کی سیکڑوں پرتیں پوشیدہ ہیں''

کچھ دیر بعد یوں لگا، جیسے کوئی میری شہ رگ پر اپنا منھ رکھے تیزی سے میری سانس چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑے جا رہے ہیں۔

اس تخلیقی زبان و بیان کے سبب ''جوگیا'' ابتدا سے انجام تک ایک art gallery بن گیا ہے جہاں متعدد تصویریں بے شمار رنگوں کے ساتھ ذہن و دل کی دیواروں پر آویزاں ہیں۔ □□□

Dr. Shaivya Tripathi
Urdu Department
Bareilly College
Bareilly-243001(U.P)

فردوس احمد میر

آزادی کے بعد عورتوں کی سماجی حیثیت

(خواتین افسانہ نگاروں کے حوالے سے)

آزادی کے بعد جہاں ملک کے تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں وہیں عورتوں کے مسائل بھی سامنے آئے۔ دراصل عورتوں کے حقوق کا مسئلہ وہ اہم مسئلہ ہے جو تاریخ کے ہر دور میں دانش وروں اور مفکروں کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ آزادی کے بعد لکھے گئے افسانوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورت اب تک فرسودہ رسم ورواج اور مرد کے بنائے ہوئے قوانین میں جکڑی ہوئی ہے۔ اگرچہ آج کی عورت مرد کے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہے اور اسے سماجی و سیاسی حقوق بھی حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے مسائل کا کوئی مثبت حل سامنے نہیں آپایا ہے۔ جہاں جہیز کی رسم اور بیواؤں کی دوسری شادی آج بھی مسئلہ بنی ہوئی ہے وہیں جدید عہد میں عورت کی مغرب پرستی اسے تیزی سے تباہی وبربادی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس عہد کی عورت تعلیم حاصل کر کے معاشی طور پر خود کفیل ہونا چاہتی ہے اور وقت آنے پر مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہے لیکن مردوں کے لاشعور میں چھپی ہوئی عورتوں پر حکمرانی کے جذبہ نے عورت کو کبھی بیدار نہیں ہونے دیا۔ غرض یہ کہ اس عہد کی عورت گھر کی چہار دیواری کے باہر سانس تو لے رہی ہے لیکن ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب چکی ہے۔ آزادی کے بعد عورتوں کے مختلف مسائل کو جہاں مرد افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے وہیں خواتین افسانہ نگاروں نے بھی اپنے ذاتی مشاہدات اور فنی وفکری نقطہ نظر کی بنا پر ان مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں حقیقت نگاری کو وسیع معنوں میں سب سے پہلے عصمت چغتائی نے فروغ دیا۔ انھوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے انسان کی محرومیوں اور زندگی کے تجربوں کو بے باکانہ انداز میں پیش کیا۔ عصمت نے عورت کو گھر کی چہار دیواری سے باہر نکالا اور اس کے سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا۔ بقول شرون کمار:

> ''مسلم متوسط طبقہ کی عورت کو اپنا بہترین ترجمان عصمت میں ملا ہے۔ انھوں نے اس مخصوص طبقہ کی عورتوں کی جنسی لگن اور نفسیاتی کیفیتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ عورتوں کو سماج میں ان کا صحیح مقام دلانا چاہتی ہیں۔ اس پر بے جا پابندیاں اور اسے صرف جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھنا، اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔'' (اردو فکشن۔ مرتب آل احمد سرور۔ ص 214)

عصمت کا شمار سماجی حقیقت نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا براہ راست رابطہ سیدھے سادے سماج سے ہے۔ ان کے عمومی موضوعات میں دولت کی تقسیم اور اس کے مضر اثرات، تقسیم کا المیہ، شہری زندگی میں پایا جانے والا تصنع اور عورت کو مرد کی ملکیت تصور کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے ایسے افسانے تحریر کیے جن میں جنسی گھٹن، ناآسودگی اور غیر فطری حرکات کا اظہار ہوا ہے، خواہ وہ افسانہ ''بہو بیٹیاں'' ہو یا ''دو ہاتھ'' ہو یا پھر ''گھروالی'' یا ''بھولی'' ان کا ہر افسانہ سماجی زندگی کا آئینہ دار اور عکاس ہے۔

عصمت چغتائی نے معاشرے کے درد وکرب کو پہلی بار افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' میں پیش کیا۔ یہ اقتصادی بدحالی کے شکار خاندان کی

دردناک کہانی ہے۔ یہ ہمارے سماج کا المیہ ہے جو آئے دن ہم دیکھتے ہیں۔ اطہر پرویز اس افسانے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''عصمت چغتائی کا افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' ایک معاشرے کا درد و کرب ہے۔ یہاں عصمت کرشن چندر کی طرح تلمیح نہیں کرتیں، لیکن وہ چپ چاپ ایک کیمرہ لیے ہوئے کبریٰ کے گھر میں پہنچ جاتی ہیں اور ان تمام ان کہی باتوں کی تصویر کھینچ لیتی ہیں جنھیں کبریٰ کی ماں سوچتی ہے کہتی نہیں ۔۔۔ معاشرے کا جبر بھی ہوتا ہے کہ انسان کبھی کبھی اسے اپنے آپ سے بھی نہیں دہرا سکتا۔''

(اردو کے تیرہ افسانے۔ص 12)

اسی طرح افسانہ ''ساس'' میں ساس بہو کے حوالے سے سماجی ناہمواری کو نشانۂ تضحیک بنایا گیا ہے۔ افسانہ ''سونے کا انڈا'' میں عصمت نے سماج کی اس خامی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں لڑکے کی پیدائش پر جشن منایا جاتا ہے مگر لڑکیوں کی پیدائش پر چہرے مرجھا جاتے ہیں۔ ''گیندا'' ایک مشہور افسانہ ہے جس میں عورت کے نازک ترین جذبات و احساسات کی ایسی جاندار ترجمانی ملتی ہے جو ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں ایک غریب اور معصوم بچی کا جنسی استحصال اس طرح ہوتا ہے کہ زبان بیان کرنے سے قاصر اور قلم لکھنے سے عاری ہے۔ غرض عصمت نے ہر طبقہ کے انسانی رشتوں کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے اور اس میں زندگی کی حرارت بھر دی ہے۔

صالحہ عابد حسین نے تقریباً اس زمانے کے ہر ایک موضوع پر قلم اٹھایا اور سماج کی برائیوں اور خامیوں کو بے نقاب کیا۔ ان کی تحریریں حقیقی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل، ان کی زندگی، معاشرے کی اصلاح، مسلم متوسط طبقے کی معاشرت اور زندگی کے المیے کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جو اسلامی افکار، مشترکہ تہذیبی اقدار، سماجی بصیرت اور ذاتی تجربوں کی عکاسی ملتی ہے وہ اس بات کی ضامن ہے کہ صالحہ عابد حسین کی تخلیقات کے پیچھے ایک فلسفۂ حیات پنہاں ہے۔

صالحہ عابد حسین نے ہندوستان کی مٹتی ہوئی تہذیب، بدلتی ہوئی قدروں اور نسلوں کے فرق کو دل سے محسوس کیا ہے لہٰذا اس پرآشوب ماحول میں ایک حساس دل کا بے چین ہونا لازمی ہے۔ انھوں نے اس بے چینی کو قلم کے ذریعہ دور کیا اور سماج سے منسلک بہت سے مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ اپنی کہانیوں میں تہذیب کی عکاسی کے علاوہ طبقۂ نسواں کی آزادی اور اس سے جڑے دوسرے مسائل کے بارے میں بہترین نقطۂ

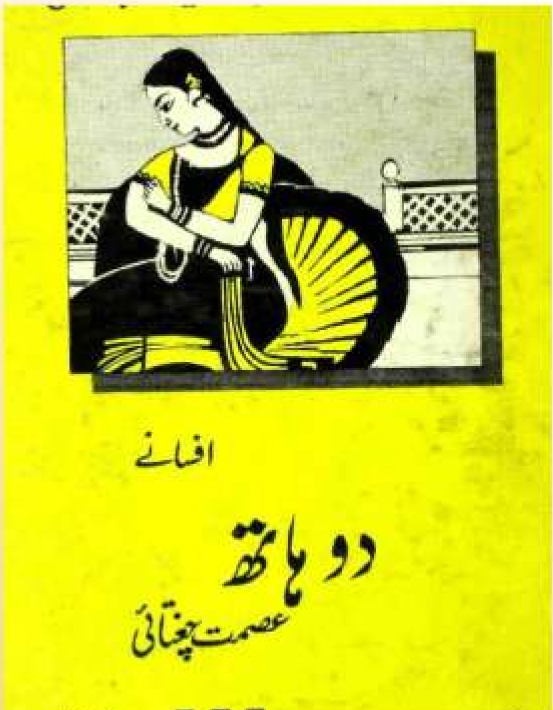

نظر رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی، تقسیم ملک سے پیدا شدہ مسائل کی سماجی وانفرادی صورت حال اور انسان کی بے بسی و ناکامی جیسے مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ''رقاصہ'' صالحہ عابد حسین کا بہترین افسانہ ہے جس میں ایک گھریلو عورت عزت و وقار کو نہ صرف بچانے کی کوشش کرتی ہے بلکہ اپنے شوہر کے ہاتھوں اٹھائی گئی ذلت کی وجہ سے غلط راستہ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں ان عورتوں کی برسوں سے دبی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے جو شوہر کی بدسلوکی کے خلاف نہ صرف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں بلکہ بغاوت کا اظہار بھی کرتی ہیں۔

افسانہ ''لکشمی'' سماجی نفسیات کو ظاہر کرتا ہے جہاں ہر طرف مردوں کی حکومت ہے۔ صالحہ عابد حسین نے اس افسانے میں توہم پرستی، عورتوں کے استحصال، جہالت کی وجہ سے سماج میں ہونے والی برائیاں، مذہبی پیشواؤں کی بے راہ روی اور مردوں کی نفسیات کو واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانہ ''سنبھالا'' عورتوں کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس میں عورتوں کی مظلومیت، بے چارگی، ان کی سماجی حیثیت، فرسودہ جابرانہ رسومات کے ساتھ قدیم وجدید اقدار کی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صالحہ عابد حسین کے افسانے عام سماجی و معاشرتی مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا مقصدِ حیات لاشعوری طور پر افسانوں میں پنہا ہو گیا ہے جو یقیناً قابل ذکر ہے اور اسی وجہ سے ان کو افسانے کی تاریخ میں

اہم مقام حاصل ہوا ہے۔

قرۃ العین حیدر خواتین افسانہ نگاروں میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ اگر چہ انھوں نے بھی دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح اپنے افسانوں میں عورت اور اس کے مسائل کو اہم موضوع بنایا ہے لیکن ان کے یہاں عورت بالکل مختلف روپ میں نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر اپنے افسانوں میں عورت کو گھر کی چہار دیواری میں محض بچہ پیدا کرنے یا مرد کے ظلم وستم کو سہنے والی عورت کے روپ میں پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کے یہاں موجودہ دور کی عورت کا کردار اور اس کے مسائل ظاہر ہوتے ہیں۔ موجودہ دور کی عورتوں میں تعلیمی یا پھر کسی دوسرے اعتبار سے بہت حد تک تبدیلیاں آرہی ہیں لیکن اتنی تبدیلیوں کے باوجود عورت اب بھی کمزور ہے اور اس کا ذمہ دار ہمارا سماج اور معاشرے کا وہ مرد ہے جو عورت کو محض اپنے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے اور مقصد حاصل کر لینے کے بعد بے اعتنائی برتتا ہے۔ یہ بات ہر طرح کے رشتوں میں پائی جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے کردار کو یوں پیش کیا ہے:

''عورت دنیا کو پُر مسرت، روشن، خوش گوار بنانے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے لیکن آخر میں وہ کسی کو بھی خوش نہیں کر پاتی۔ اس کی ساری محنت رائیگاں جاتی ہے۔ کائنات کو خوب صورت بنانے کی ذمہ داری خدائے قدوس نے عورتوں کے نازک شانوں پر ڈالی ہے لیکن اسے بعد میں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سب غلط اور بیکار ہے۔''

(قرۃ العین حیدر کا فن، از ڈاکٹر عبدالمغنی۔ ص 18)

افسانہ ''یادوں کی ایک دھنک جلے'' میں گریسی نام کی ایک معمولی عورت کی کہانی پیش ہوئی ہے جو خلوص ومحبت کا پیکر اور شریف اور ایمان دار ہے۔ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود وہ شہری طور طریقہ اور اعلیٰ گھرانے کے رہن سہن سے پوری طرح واقف ہے لیکن اس کا شوہر عین جوانی میں ہی اسے داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔ اس طرح وہ تیس برس کی عمر سے ہی ناصر چچا کے گھر میں نوکر ہے۔ اس گھر کو وہ بالکل اپنے گھر کی طرح سنبھالتی ہے لیکن اس کے حصے میں بے بسی اور خالی پن کے سوا کچھ نہیں آتا۔ قرۃ العین حیدر نے اس کردار کے ذریعہ عورتوں کی جو عکاسی کی ہے وہ تقریباً ان کے سبھی افسانوں میں جھلکتی ہے:

''عورتیں اتنی پرستار، اتنی پورجائیں کیوں ہیں؟ اس لئے کہ وہ کمزور ہیں اور سہارے کی حاجت مند ہیں، اس لیے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت

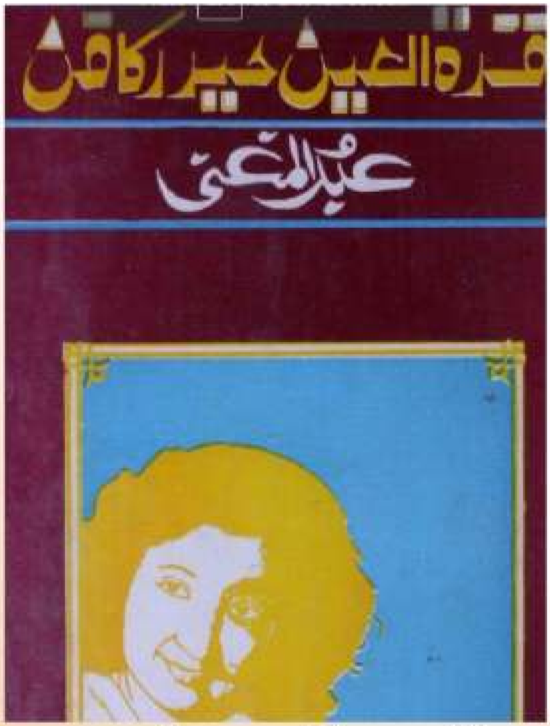

کرتی ہے۔ باپ، بھائی، شوہر، اولاد، پوتے، نواسے، سب کے تحفظ اور سلامتی کے لئے فکر مند رہتی ہے۔ شوہر یا محبوب کے پیار کی ضمانت کسی ان دیکھی طاقت سے چاہتی ہے۔ ان بچوں کے مستقبل کے لئے ہراساں رہتی ہیں۔ آخر عورتیں اس قدر خدا کی ضرورت مند کیوں ہیں؟ عورتیں کمزور ہیں مگر ویلنٹینا بھی تو ہے جو عین اس وقت خلاء کے سفر میں مشغول ہے۔۔۔۔ اور عورت کمزور بھی ہے۔''

قرۃ العین حیدر نے عورت کو بنیادی طور پر معصوم قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عورت مظلوم ہے جس کی ہمیشہ حق تلفی کی گئی ہے۔ مرد نے ہمیشہ اسے اپنے حرص و ہوس کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ عورت خواہ تھائی لینڈ کی کارمن ہو یا کراچی کی ثریا یا ممبئی کی گریسی سب کی سب مرد کی مکاری کا شکار نظر آتی ہیں۔ اس ضمن میں قرۃ العین حیدر کے افسانے ''پت جھڑ کی آواز'' اور ''فوٹو گرافر'' قابل ذکر ہیں۔

ہاجرہ مسرور کے افسانوں کی ابتدا اگر چہ جنسی حقیقت نگاری سے ہوئی مگر وہ جلد ہی سماجی حقیقت نگاری کی طرف راغب ہو گئیں۔ انھوں نے زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی، اخلاقی، اصلاحی اور واقعاتی رجحان پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے افسانے عاقبت، بھالو،

لاعلاج، سرگوشیاں، آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے، تیسری منزل، فاصلے، فضل دین اور کمپنی وغیرہ میں عورتوں کے مسائل اور ان درد و کرب کو پیش کیا گیا ہے۔ ہاجرہ مسرور کے کردار سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں واقعات سے زیادہ پیچیدہ کردار نظر آتے ہیں جو ہمہ وقت اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ یہ کردار اطراف میں پھیلے ہوئے لوگ ہیں جو سماج کا حصہ ہیں۔ ان کی اپنی خوشی اور غم ہے، اپنے جذبات و احساسات ہیں، وہ اپنی خواہشات کے اظہار میں کہیں پابند ہیں اور کہیں سماجی قدروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کا اظہار کر لیتے ہیں۔

ہاجرہ مسرور نے جنس کے ذریعے معاشرے میں پلنے والی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کے یہاں پیٹ کی بھوک اور جنسی مسائل ہیں اور ساتھ ہی ان دونوں میں تصادم بھی ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے 'کتے، خرمن، سرگوشیاں' قابل ذکر ہیں۔ جن میں مصنف نے اپنے تجربے سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرہ میں سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اقتدار کی وجہ سے عورت گھٹن کا شکار ہے، وہ جو چاہتی ہے نہیں کر پاتی۔ عورتوں پر معاشرے کا جبر مسلط ہے۔ ہاجرہ مسرور کا ایک بہترین افسانہ ''اندھیرے اجالے'' سماجی نابرابری اور عورتوں کے استحصال پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے لوگوں کے دبے کچلے احساسات و جذبات کی عکاسی کر کے اس نظام کی صحیح تصویر قاری کے سامنے پیش کی ہے جہاں عورت کا استحصال ہر طرح ہوتا ہے۔

خدیجہ مستور نے اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری، انسانی بے بسی اور فرد کی تنہائی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے موضوعات میں پختگی اور فکری گہرائی ہے۔ وہ جہاں عورت کی مظلومیت کو سامنے لاتی ہیں وہیں مرد کی بربریت کو بھی نشانہ بناتی ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر سماجی، عمرانی اور معاشی اسباب و علل سے بنتا ہے۔ ان کے افسانوں میں احساس کی دھیمی دھیمی لہر ہے جس میں انقلاب کا رنگ نہیں بلکہ فکر و عمل کی دعوت نظر آتی ہے۔ خدیجہ مستور نے خواتین کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اور عورتوں کی بے بسی اور مظلومیت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کا شاہکار افسانہ ''دادا'' اس کی بہترین مثال ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک عام عورت کا دادا بننا اس احساس کمتری کا نتیجہ ہے جہاں عورت زندگی کی تکلیفوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنی کمزوری کو طاقت میں بدل دیتی ہے۔ اسی طرح افسانہ ''آخر کار'' میں توہم پرستی کی وجہ سے پیش آنے والے مسائل اور سماج میں لڑکیوں پر بے جا حدبندیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مختصراً ہم یو کہہ سکتے ہیں کہ خدیجہ مستور کے افسانوں میں طبقاتی کشمکش، تحفظِ انسانیت، جنسی استحصال اور گھر کی گھٹی ہوئی فضا میں دم توڑتے نسائی جذبات ہیں۔

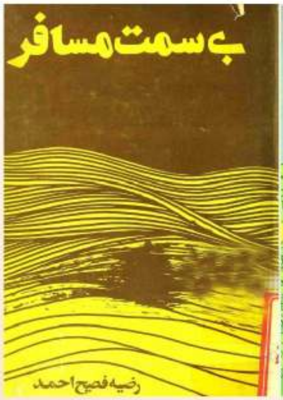

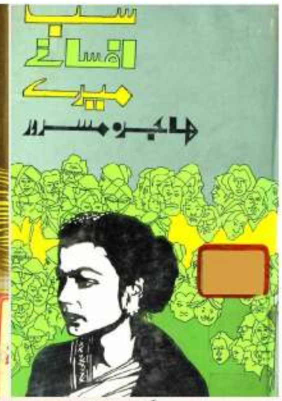

صدیقہ بیگم نے جس وقت افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت اشتراکیت کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہندوستان غلام تھا اور خواتین سماجی و اصلاحی کاموں میں کم ہی سرگرم عمل نظر آتی تھیں۔ صدیقہ بیگم نے اپنے ہم عصروں میں رشید جہاں کا اثر قبول کیا اور ان ہی کی طرح معاشرے کے ناسوروں کو کھل کر بیان کیا۔ ان کے افسانوں میں ملک کی تقسیم، اشتراکی مسائل، سیاسی بازی گری سے لوگوں کی بڑھتی پریشانیوں کی عکاسی ملتی ہے۔ جہاں ان کے افسانوں میں قحط بنگال، سرمایہ دارانہ نظام، جاگیردارانہ سماج، متوسط اور اعلیٰ طبقے کے گھریلو ماحول کا منظر نامہ پیش ہوا ہے وہیں انھوں نے خواتین کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کے یہاں بھیک مانگتی ہوئی عورتیں، گھریلو لڑکیوں کی ذہنی کشمکش اور گھٹن، نوکرانیوں کا کرب، کالج کے لڑکے لڑکیوں کے مسائل ملتے ہیں۔ اس طرح کی کہانیوں میں راکھ اور چنگاری، تارے لرز رہے ہیں، عمل اور ردعمل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے یہاں حیات انسانی کا عمیق مطالعہ نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلامت اللہ:

> ''موضوع کے لحاظ سے دیکھیں تو صدیقہ کے افسانوں میں خاصہ تنوع ملے گا۔ انھوں نے تقریباً وقت کے ہر اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں جنگ، تقسیم ملک، فسادات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل، فرقہ وارانہ منافرت، بے روزگاری، طبقہ داری، جدوجہد، شہرت وغیرہ سبھی کے خاکے ملتے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام چیزوں کو عوام کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں عام لوگوں کی آرزوئیں، ولولے، حوصلے، امنگیں اور ارادے جھلکتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔" (دودھ اور خون۔ دیباچہ۔ ص 14)

رضیہ فصیح احمد اپنے افسانوں میں کسی نہ کسی اخلاقی نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے بھی دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح سماجی مسائل پر قلم اٹھایا۔ مشرق و مغرب کی باہمی آویزش، عورت و مرد کے مزاج کا تضاد، قوت برداشت، شناخت کا مسئلہ اور مختلف نظریات رکھنے والے لوگوں میں اختلاف ان کے افسانوں کے موضوعات رہے ہیں۔ ان کے افسانے 'بے سمت مسافر، چوہا، ساستا وغیرہ میں عورتوں کے مختلف مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ جیلانی بانو کا "سونا آنگن"، واجدہ تبسم کا "اترن" اور "نتھ کا بوجھ"، شکیلہ اختر کا "آنکھ مچولی"، تسنیم سلیم چھتاری کا "رقص شرر کے بعد"، "نگاہیں" اور "کسک"، الطاف فاطمہ کا "جسے چاہا گیا" وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں عورتوں کے مختلف مسائل کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں کردار اور پلاٹ ضرور بدل گئے ہیں لیکن ان کے ہاں بھی خواتین کی سماجی نابرابری اور ناہمواریوں کی عکاسی بھرپور انداز سے کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں کا تجزیہ اس بات کا ضامن ہے کہ چونکہ افسانہ نگار بھی سماج کا ہی ایک فرد ہوتا ہے، وہ سماجی ناہمواریوں اور فرسودہ رسم و رواج کی جکڑ بندیوں کو اپنی چشم دل سے دیکھتا رہتا ہے، اس لیے ان کے افسانوں میں ان عناصر کی کارفرمائی لازمی ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کے افسانوں سے یہ ادراک ہوتا ہے کہ انھوں نے سماج کا بہ غور مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور اپنے اپنے انداز میں بڑی دردمندی اور خلاقی کے ساتھ ان عناصر کو اپنی کہانیوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

□□□

Firdous Ahmad Mir
R/O Mahind Bijbehara
Anantnag-192401 (Jammu & Kashmir)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................بتاریخ.............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

فیاض حمید

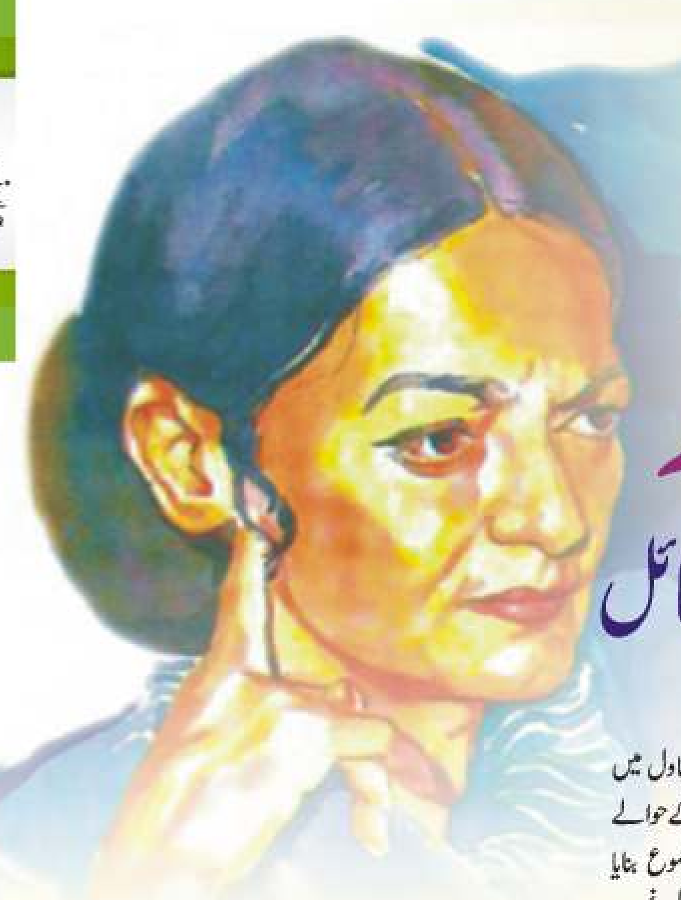

خدیجہ مستور
'زمین' اور معاشرتی مسائل

'زمین' خدیجہ مستور کا ناول ہے جو1948 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انھوں نے تقسیم وطن کے بعد پاکستان میں مہاجر مسلمانوں کے حوالے سے نئی پاکستانی مملکت کے اخلاقی اور سیاسی زوال کو موضوع بنایا ہے۔خدیجہ مستور ترقی پسند اسکول سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے انھوں نے فرد کی اندرونی دنیا کے علاوہ خارجی زندگی کے بکھرے ہوئے مظاہر پر نگاہ ڈالی۔ آزادی سے قبل ہندوستان میں رہیں اور آزادی کے بعد پاکستان چلی گئیں۔ اس طرح سے ان کا واسطہ دونوں ملکوں کی سیاسی، سماجی و معاشرتی دنیا سے پڑا جن کو مصنفہ نے اپنے ناولوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ناول ''زمین'' کا موضوع خدیجہ مستور کے پہلے ناول کی توسیع ہے۔ 'آنگن'' کا موضوع قیام پاکستان سے قبل کی آزادی کی جدوجہد ہے۔ خاص طور پر وہ مسلم گھرانے جو مسلم لیگ میں باقاعدہ شریک تھے۔ جب کہ قیام پاکستان کے بعد کے مسائل کو ایک چھوٹے سے گھرانے کے توسط سے ''زمین'' میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے مسئلہ ہجرت کے بعد مہاجر کیمپ، وہاں کا ماحول، لوگوں کا رویہ، ان کے جذبات اور پھر مہاجروں کی آبادکاری کا مسئلہ، غریبوں پر استحصال، ذات پات، جاگیردانہ ظلم، تقسیم وطن کے وقت اغوا عورتوں کی درد بھری زندگی کی جھلکیاں اس ناول میں پیش کی گئیں ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک مہاجر لڑکی ساجدہ کے روز وشب کی داستان ہے جو اپنے باپ کے ساتھ یوپی سے ہجرت کر کے لاہور کے والٹن کیمپ میں آباد ہے۔

ہجرت کے بعد کوٹھیوں کی جعلی الاٹ منٹ، زمینوں اور باغوں کی لوٹ، مہاجرین کا مظلوم بن کر کپڑے اور سونے کی اسملنگ کرنا، خود اس کے باپ کا جھوٹ بولنا اور پھر مر جانا وغیرہ یہ سب کارنامے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ وہ دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔ ساجدہ کے والد کے انتقال کے بعد ناظم جس سے ساجدہ کی ملاقات کیمپ میں اس کے والد کی زندگی میں ہوئی تھی، اپنی رشتے کی بہن سلیمہ کے ساتھ آکر، اسے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ اگرچہ ساجدہ فسادات اور اس دور کی تمام صورت حال کے متعلق ناظم کی طنزیہ گفتگو سن کر اسے ایک ظالم انسان سمجھتی تھی لیکن وہ اپنے حالات اور سلیمہ کے اصرار سے مجبور ہو کر ان کے ساتھ چلی جاتی ہے۔

خدیجہ مستور نے اگرچہ اس ناول میں سیاست کو بھی موضوع بنایا ہے لیکن ناول کا اصل موضوع گھر اور اس کے مسائل ہیں جو ایک مختصر سا مہاجر کنبہ ہے۔ جس کے افراد میں مالک، اس گھرانے کا سرپرست، صابرہ ان کی بیوی، ناظم اور کاظم ان کے بیٹے ہیں۔ سلیمہ اور اس کی ماں جو گھر میں خالہ بی کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ یہ ناظم کی ماں

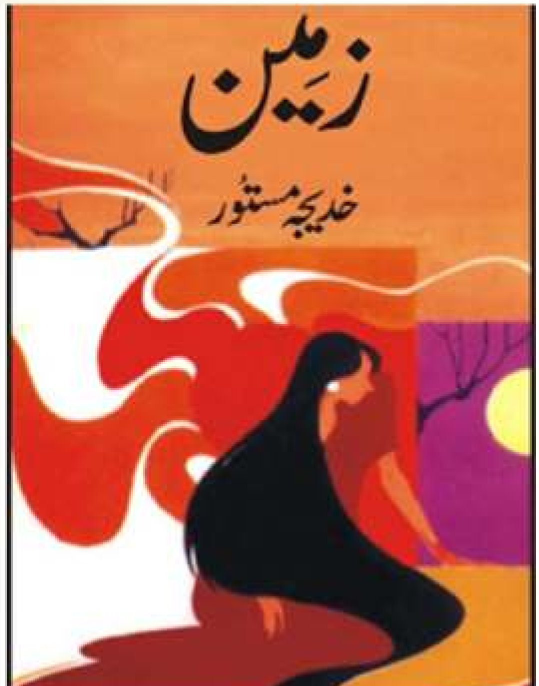

کی رشتہ کی بہن ہے جن کے بیوہ ہوجانے کے بعد ناظم کے باپ ایک بچی سلیمہ کے ساتھ انھیں اپنے گھر لے آتے ہیں جو ایک زمانے میں سلیمہ کی ماں کے عاشق تھے۔ ناول کا مرکزی کردار ناظم انتہائی ایماندار، نیک نفس اور کشادہ ذہن ہونے کی بناء پر نئے پاکستانی معاشرے میں مذہبی تنگ نظری، معاشی لوٹ کھسوٹ اور شخصی آزادیوں پر عائد پابندیوں کے خلاف عمل پیرا نظر آتا ہے جبکہ اس کا بھائی کاظم انتہائی خودغرض اور ہوس پرست انسان ہے۔ کاظم گھر میں قیام پذیر ایک اور پناہ گزیں لڑکی تاجی کو موقع بے موقع استعمال کرتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر بن کر وہ اور بھی خودغرض و بے رحم ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوسری بار کاظم کی ناجائز اولاد کو پیٹ میں ختم کرانے کے سلسلے میں تاجی کی موت واقع ہوجاتی ہے اور ناظم اور ساجدہ شادی کرکے گھر بسا لیتے ہیں۔ ناظم جو پاکستانی قوم و معاشرے کے سارے مسائل کا حل اشتراکیت کو سمجھتا ہے لیکن تنگ نظری اور مذہبی جنون پر مبنی وہ سیاسی نظام جو ہندوستانی فلموں کے گیتوں کو بھی غیر اسلامی قرار دیتا ہے، ناظم کو فوجی اذیت خانے میں پہنچا دیتا ہے۔ مگر ساجدہ تنہا حالات کا مقابلہ کرکے اپنی ہمت کا ثبوت دیتی ہے۔ ناظم ساجدہ سے شادی کرکے روایت سے بغاوت کرتا ہے۔ خدیجہ مستور یوں لکھتی ہیں:

> ''مالک جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو خالہ بی رو پڑیں، کیا ہم اپنے برابر کے لوگوں میں شادی نہیں کرسکتے تھے؟ مگر ناظم نے۔۔۔۔۔'' ایک ایماندار منشی کی بیٹی سے شادی کرلی۔ ساجدہ نے حقارت سے خالہ بی کی طرف دیکھا۔ کیا یہ سچ ہے ناظم؟ مالک بہت سنجیدہ تھے۔۔ ہاں مالک! مجھے ساجدہ سے محبت ہے، میں نے اس سے شادی کرلی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، میں آپ سے اجازت نہ لے سکا، میں سمجھتا ہوں کہ محبت کے معاملات میں کسی کی اجازت' خوشی یا ناخوشی کا دخل نہیں ہوتا۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔''

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوت والی بھوجلہ دہلی: سنہ اشاعت: 2000: ص 148)

پاکستانی معاشرہ ابتدا ہی سے جس اخلاقی انحطاط کا شکار چلا آرہا ہے خدیجہ مستور کے قلم نے نہایت بے باکی اور جرات سے اس کی تصویر کشی ناول میں کی ہے۔ چنانچہ کاظم جو یہاں کے بیوروکریٹس کا نمائندہ ہے اپنی اصل شکل و صورت میں ایک نچلے درجے کا شہری اور ذاتی حرص و ہوس کا غلام نظر آتا ہے۔ وہ کوٹھیوں اور باغوں کی الاٹ منٹ کا خواہاں ہے۔ انسانی قدریں اس کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتیں ہیں وہ مجبور اور بے بس لوگوں کا استحصال کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ تاجی کو بار بار ہوس کا شکار بناتا ہے۔ لیکن اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی صفائی میں یوں کہتا ہے کہ:

> ''آپ اس چکر میں نہ پڑیں، تاجی سے میں فائدہ نہ اُٹھاتا تو کوئی اٹھاتا! وہ دنیا میں اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے چھوٹے سے ذہن میں کسی رشتے ناطے کا خیال تک نہ آتا ہوگا۔''

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوت والی بھوجلہ دہلی: سنہ اشاعت: 2000: ص 187)

کاظم کی اس گھٹیا سوچ اور ہٹ دھرمی کے پیچھے ہمیشہ خالہ بی کا ہاتھ ہوتا ہے جو اس کی ناجائز خواہش کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہیں، اور اس کی زیادتیوں کو ہمیشہ پس پردہ رکھتی ہیں۔ کاظم جب ساجدہ کو بھی اپنی ہوس کا شکار بنانے کے لیے آتا ہے تو ساجدہ اسے جھڑک دیتی ہے۔ مصنفہ اس کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ''کاظم! یہ تاجی کا کوارٹر نہیں، میرے کمرے سے نکل جاؤ، تم غلط جگہ پر آگئے ہو۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔۔ تاجی تم سے بہت اچھی ہے، وہ ہمارا نمک کھاتی ہے تو حق نمک بھی ادا کرتی ہے، اور تم ہمارے ٹکڑوں پر پل رہی ہو اور

ہمیں کو کمرے سے نکلنے کا حکم دیتی ہو۔تم کچھ بھی نہیں
ہو،تمھارا اور کوئی مصرف نہیں ہے، سمجھ گئیں منشی کی اولاد۔"

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوٹ والی بھوجلہ دہلی: سنہ اشاعت:2000:ص127)

ناول میں تاجی ایک ایسی لڑکی تھی جو ہندوستان سے پاکستان آنے والے قافلے کے ساتھ آئی تھی۔جنھیں بیٹی بنا کر ناظم اور کاظم کی والدہ گھر میں لاتی ہے کیونکہ ان کے یہاں کوئی بیٹی نہیں ہوتی اور پھر نوکرانی کی حیثیت سے اس سے گھر کی خدمت کروائی جاتی ہے۔چونکہ گھر میں حکومت خالہ بی کی ہے اس لیے گھر کی ساری ذمہ داریاں اور گھر کا سارا کام تاجی کو سونپ دیا جاتا ہے۔ساجدہ کے آنے سے اگرچہ اُس کو تسلی ملتی ہے کہ اب گھر کا کام بٹ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوتا اس لیے ساجدہ سے جل کر تاجی کہتی ہے:

"بڑی بیگم جب مجھے کیمپ سے لائی تھیں تو انھوں نے یہی
کہا تھا کہ میں تجھے اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی میری کوئی بیٹی
نہیں ہے۔میں ان کو اماں کہتی تھی۔مگر ہوا کیا، سلیمہ باجی کی
اماں نے مجھے اس گھر کی نوکرانی بنا دیا۔تنخواہ میں صرف
روٹی کپڑا۔مجھے بیٹی بنانے والی چپ چاپ یہ سب کچھ
دیکھ رہی ہے۔میں بھی انھیں اماں نہیں کہتی۔"

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوٹ والی بھوجلہ دہلی: سنہ اشاعت:2000:ص50)

پورے ناول میں وہ اپنے استحصال کا زبان سے کبھی اظہار نہیں کرتی۔صرف اس کا کردار اور عمل استحصال کو نمایاں کرتا رہتا ہے۔پاکستان بننے سے قبل اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے اور ماں دوسری شادی کر کے اس کو پاکستان بھیج دیتی ہے یہ شدید محبت کی قائل ہے۔اس کی محروم زندگی میں محبتوں کا قحط ہے اس لیے وہ اپنا آپ داؤ پر لگا دیتی ہے۔مگر اس کی محبت کو قدر دان نصیب نہیں ہوتا۔اس لیے ساجدہ سے کہتی ہے:

"قصور میرا ہے باجی! پہلی بار جب کاظم نے کہا تھا کہ وہ
مجھ سے محبت کرتا ہے، تو میرا تن من سب پگھل گیا تھا۔یہ
محبت کیا چیز ہوتی ہے باجی؟ خالہ بی نے مجھے گالیاں دی
تھیں کہ میں ان کے معصوم بیٹے کو بگاڑ رہی ہوں
مگر۔۔۔۔۔۔اور اب ان کا معصوم بیٹا، ان کا افسر راجہ
جب چاہتا ہے مجھے رشوت کے مال کی طرح کھا لیتا ہے اور
خالہ بی۔"

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوٹ والی بھوجلہ دہلی: سنہ اشاعت:2000:ص:177)

ناول کا مرکزی کردار ساجدہ ہے جو کہ بلند عزم، مستقل ارادے اور اعلیٰ کردار کی حامل ہے۔بچپن میں صلاح الدین سے محبت کرتی ہے اور جوانی تک اُس کا انتظار کرتی ہے اور اپنے والد کی موت کے بعد ناظم کے گھر رہنے چلی جاتی ہے۔جہاں پر خالہ بی اُس کو بھی تاجی کی طرح گھر کا کام کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے لیکن ساجدہ ایک خوددار لڑکی ہے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خالہ بی سے کہتی ہے:

"مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں یہاں رہ کر اپنی تعلیم پوری کر
لوں گی۔رہ گئے برتن، تو خالہ بی! آپ بھی میرے ساتھ
اٹھوایئے، میں تاجی نہیں ہوں"

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوٹ والی بھوجلہ دہلی: سنہ اشاعت:2000:ص62)

ساجدہ کا کردار پورے ناول میں شروع سے آخر تک موجود ہے اور ہمیں اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات و جذبات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خوشیوں سے محروم رہنے والی ساجدہ ہمیشہ ملکی مفاد کو اپنے مفادات سے مقدم سمجھتی ہے جو دوسروں کے دکھوں میں شریک ہونا اپنا اولین فرض سمجھتی ہے اور تاجی کے استحصال پر آواز احتجاج بھی بلند کرتی ہے۔اس گھر میں باعزت فرد کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے لیے اور کاظم کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اس کے بھائی ناظم سے شادی کر لیتی ہے لیکن شادی کے بعد ہی کاظم سے یوں بات کرتی ہے:

"تم، کاظم! اتنے بدتمیز ہو کہ یہ تک نہیں جانتے کہ اپنی
بھاوج کو کس طرح دیکھنا چاہیے!تم کو سلام کرنے کی بھی
تمیز نہیں ہے۔بھاوج! خالہ بی کرسی سے اس طرح اُچھل
پڑیں جیسے کمرے میں بم کا دھماکہ ہوا ہو۔ہاں بھاوج' خالہ
بی! بھاوج۔۔آج اس کی آواز میں غرور تھا۔اپنے لاڈلے کو
تمیز سکھایئے ورنہ میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔کاظم کی
نظریں میز پر جھکی ہوئی تھیں۔"

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوٹ والی بھوجلہ دہلی: سنہ اشاعت:2000:ص147)

اس کے بعد ساجدہ کی کہانی آئیڈیل بیوی اور ہمدرد عورت کی ہے جس نے ہر قدم پر شوہر کا ساتھ دیا اور اس کی تمام سرگرمیوں میں معاون ثابت ہوئی۔اس کے ساتھ ہی اس نے زمیندار کی بیوی لالی اور تاجی کے سلسلے میں جو انسانی رویہ اختیار کیا وہ مزید اس کی رحم دلی اور مظہر بن کر سامنے آتا ہے۔

اس ناول میں ناظم کی ماں کا کردار ایک روایتی ہندوستانی یا پاکستانی مظلوم عورت کا کردار ہے جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے

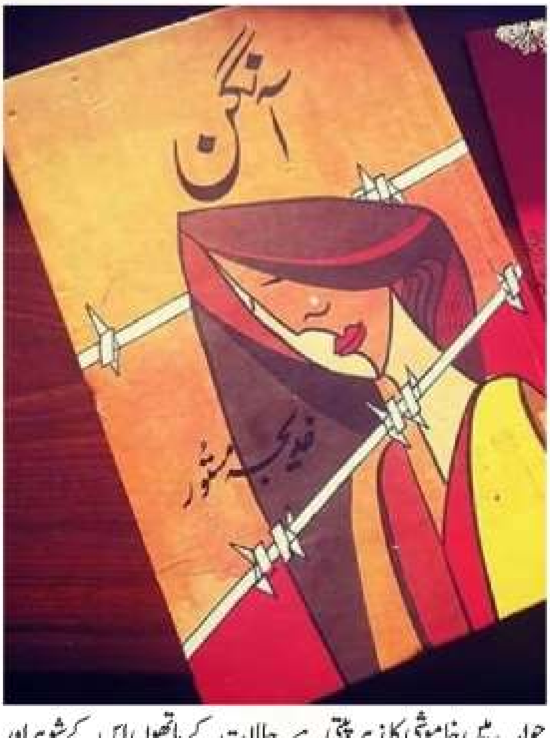

جواب میں خاموشی کا زہر پیتی ہے۔حالات کے ہاتھوں اس کے شوہر اور بچے سب اس سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔اس پورے گھر پر سلیمہ کی ماں بے تاج بادشاہ کی طرح حکومت کرتی ہے اور ناظم کی ماں اس صورتِ حال کو برداشت کرتی ہے۔اس کے برعکس خالہ بی کا بھی کردار ہے جو مالک سے محبت کا ثبوت دیتے دیتے اس کے بیٹے کاظم کو اتنا پیار دیتی ہے کہ بالآخر اس کی عیاشیوں اور گناہوں کو چھپانے کے لیے تاجی کا استحصال کرتی ہے۔وہ ناظم کی ماں کی جگہ لینے کے لیے سارے گھر کا نظام اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے۔اس کی اپنی بیٹی سلیمہ جانتی ہے کہ اس کی ماں نے ایک سہاگن کو بیوہ بنا رکھا ہے اس لیے وہ اپنی ماں سے نفرت کرتی ہے اور ساجدہ سے یوں کہتی ہے:

''نہیں ساجدہ بی بی!نہیں میں تو ایک ایسی عورت کی بات کر رہی ہوں جس نے ایک ایک سہاگن کو بیوہ بنا رکھا ہے اور بے چاری یہ بھی نہیں جانتی کہ اس نے تو ایک خادمہ،ایک آیا بن کر زندگی گزار دی ہے۔اس نے اپنی بیٹی کو گود سے اتار کر دوسروں کے بیٹے کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا،جانتی ہو کیوں؟اس لیے کہ وہ اپنی محبت ثابت کرے، میں بھی عورت ہوں ساجدہ بی بی!اگر میں اپنی ماں جیسی نہیں بننا چاہتی،میں کسی کی محبت چھین نہیں سکتی،میں کسی کو محبت کرنے کے حق سے محروم نہیں کر سکتی،ایسی محبت سے تو نفرت ہی بہتر ہے۔۔ساجدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔''

(زمین: خدیجہ مستور: کتاب والا گلی جھوت والی بھوجلہ دہلی؛سنہ اشاعت:2000: ص229۔228)

اس موقع پر سلیمہ کے یہ چند جملے نہ صرف خالہ بی کے کردار کو سامنے لاتے ہیں بلکہ سلیمہ کی تنہائی اور محرومی کا بھی احساس دلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ صلاح الدین ناول میں اس طبقے کی غمازی کرتا ہے جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ میں مصروف رہتا ہے۔اُمرا اور جاگیرداروں کے اس طبقے کو انسانوں سے محبت نہیں بلکہ صرف اور صرف دولت سے پیار ہے۔دولت ہی اُن کا ایمان ہے اور حصولِ دولت اُن کی زندگی کا مقصد اور اسی زر نے انھیں 'صلو' سے قابلِ نفرت صلاح الدین بنا دیا۔

مختصر یہ کہ مصنفہ نے اس ناول میں قیامِ پاکستان کے پس منظر میں وہاں کی معاشرتی،سیاسی وسماجی صورتِ حال کو پیش کیا ہے۔خاص طور پر ایک گھرانے کے حوالے سے کہانی تشکیل دی ہے جس کے کردار ایک گھر میں رہنے والوں کے متضاد طبقاتی رویوں اور معاشرتی اُمنگوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔زمانی تسلسل کے اعتبار سے ''زمین'' کو ''آنگن'' کا دوسرا جز بھی کہا جاسکتا ہے۔اس میں چونکہ مہاجرین کے مسائل کے متعلق حکومت پاکستان کے طرزِ عمل اور فرقہ وارانہ فساد کے وقت ہندو مسلم دونوں قوموں کی بے راہ روی کے تجزیے کو ناول نگار نے اپنا مقصد بنایا ہے،اس لیے وہ اپنے اس مقصد کو ہنرمندی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔دراصل قیامِ پاکستان کے بعد جس قسم کے مسائل درپیش تھے ان میں مہاجر کیمپ،مہاجروں کی آبادکاری کے مسائل کے علاوہ مفاد پرستوں نے جس طرح سے فائدے اٹھائے اس کے علاوہ نئی مملکت کے مسائل اور قائداعظم کی وفات کے بعد اُٹھنے والے اندیشے وغیرہ کو مصنفہ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

□□□

Fayaz Hameed
Research Scholar
Dept. of Urdu and Persian
Dr. Hari Singh Gour Central University
470003 (M.P)

مایوسیت اور تعلیمی تحصیل

شائستہ پروین

تعلیم حاصل کرنا ہر مومن مرد اور عورت پر فرض ہے۔

حصول تعلیم کی بدولت ہی ہر فرد کی سوچنے سمجھنے کی قابلیت وصلاحیت اور کام کرنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ بچے کی معیاری تعلیمی کارکردگی اس کی ترقی کا لازمی عنصر ہے۔ تعلیمی میدان میں بچے کی تعلیمی تحصیل کی بنیاد پر ہی اس کی قابلیت وصلاحیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ بچے اپنی قابلیت کو ظاہر کرنے کے لیے تعلیمی تحصیل پر اپنی توجہ مرکوز کرنے لگے ہیں۔ اسی بہتر تعلیمی تحصیل کی خواہش نے طلبا، اساتذہ، اور مدرسہ بلکہ مکمل تعلیمی نظام پر اپنا گہرا اثر مرتب کیا ہے گویا مکمل تعلیمی نظام طلبا کی بہتر تعلیمی تحصیل کے لیے کارفرما ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ہر طالب علم کی تعلیمی تحصیل، ذہنی سطح کی مماثلت کے باوجود ایک دوسرے سے منفرد اور الگ ہے۔ کسی طالب علم کی تعلیمی تحصیل اعلیٰ ہے تو کسی کی ادنیٰ۔ اس کے پیچھے بہت سی وجوہات ہیں۔ کچھ وجوہات جیسے اکتسابی وسائل کی عدم فراہمی، صحیح اساتذہ کی عدم حصولیابی اور بچے کی پڑھائی کے تئیں عدم دلچسپی وغیرہ سے عوام الناس باخبر ہیں۔ لیکن کچھ وجوہات ایسی ہیں جن سے عوام الناس بے خبر ہیں۔ وہ ایسی وجوہات کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ مایوسیت ایسے ہی عوامل میں سے ایک ہے۔

ہمارا جسم ہزاروں قسم کی بیماریوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے تلوؤں تک کسی بھی عضو میں کوئی بھی مرض پیدا ہو سکتا ہے۔ ہر مرض کے پیچھے ایک سبب جڑا ہوتا ہے جیسے ہمارا جسم لاکھوں خلیوں کے ملنے سے بنا ہے کسی بھی ایک خلیہ میں نقص پیدا ہونے سے جسمانی بیماری ہو سکتی ہے۔ لیکن بہت سے امراض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ہونے کے اسباب ہمارے ذہن میں پوشیدہ رہتے ہیں جنھیں نفسیاتی بیماری کہا جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو ہونے والی بیماریوں کو دو قسموں جسمانی اور نفسیاتی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ذہن سے متعلق امراض کو ہم نفسیاتی امراض بھی کہتے ہیں۔ وہ امراض جن کے اسباب مایوسیت، عصبی تناؤ، تشویش اور افسردگی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ سب کیفیات ذہن سے تعلق رکھتی ہیں اسی لیے یہ ذہنی امراض کہلاتے ہیں۔

عام طور سے ذہنی اور نفسیاتی امراض کا جب ذکر آتا ہے تو مایوسیت (Frustration)، عصبی تناؤ (Tension)، تشویش یا اضطراب (Anxiety) اور افسردگی (Depression) جیسے نام ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں۔

ذہن سے جڑے ہونے کے سبب اس کا سیدھا اثر تعلیم پر پڑتا ہے۔ کیوں کہ تعلیم کا سیدھا واٹوٹ رشتہ ذہن سے ہی ہے۔ تعلیم کو متاثر کرنے کا مطلب ہے تعلیمی تحصیل کا متاثر ہونا جو بچے کی زیست میں بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی تعلیمی تحصیل کی سطح کی بنیاد پر کامیاب و خوش اور ناکام و پریشان کن مستقبل کی امید کی جاتی ہے۔ اسی تعلیمی تحصیل کو متاثر کرنے والے جسم، ذہن اور معاشرہ سے متعلق بہت

سے اسباب ہیں۔اس میں ذہن سے متعلق ایک سبب مایوسیت ہے جس کے بارے میں ہم یہاں مختصر معلومات حاصل کریں گے کہ مایوسیت کیا ہے؟ کیوں ہوتی ہے؟ اس کی پہچان کیا ہے؟ اور اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ اور مایوسیت اور تعلیمی تحصیل کے درمیان کیا رشتہ ہے؟

لفظ مایوسیت کو انگریزی زبان میں Frustration کہتے ہیں جو لاطینی زبان کے لفظ Frustratinum سے ماخوذ ہے جس کے معنی رکاوٹ، ناکامی، پریشانی، مایوسی اور ہار ہے۔

نفسیات میں مایوسیت کا مفہوم کسی خاص ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کیے جانے والے عمل میں حائل رکاوٹ کی وجہ سے ہونے والی ایک ذہنی پریشانی ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان کی بہت سی ضرورتوں کو پورا کرنے کے راستے میں زیادہ یا کم مقدار میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے سے انسان کے اندر مایوسیت جنم لیتی ہے۔ضرورت کی تکمیل نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ذہن کی جو کیفیت ہوتی ہے وہی مایوسیت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مایوسیت جارحانہ رویہ کے ساتھ ساتھ شخصیت کے دوسرے منفی پہلوؤں کو بھی جنم دیتی ہے۔جس کی وجہ سے ایک شخص عدم مطابقت کا شکار ہو سکتا ہے۔مایوسیت پر کیے گئے مختلف تجربوں سے بہت سے اسباب سامنے آئے ہیں مثلاً استاد کے ذریعہ بچوں کے سامنے کسی تصور کو واضح نہ کرنے سے بچے اور زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔انعام دینے کا وعدہ کر کے پورا نہ کرنا۔بچوں کے حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا۔ایک ٹیسٹ کی جانچ کے بغیر دوبارہ ٹیسٹ کے لیے کہنا۔ اسی طرح والدین کے ذریعے بچوں کی خواہش اور پسند کو اندیکھا کرنا وغیرہ۔

مندرجہ بالا تحریر میں اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ مایوسیت انسان کے مقصد کے راستے میں رکاوٹ کے حائل ہونے کے سبب لاحق ہوتی ہے۔ان رکاوٹوں کی درجہ بندی درج ذیل ہے:

(i) طبعی مشکلات (Physical Obstacle)
(ii) نفسیاتی مشکلات (Psychological Obstacle)
(iii) معاشرتی مشکلات (Sociological Obstacle)
(iv) حالات کشمکش (Conflict Situation)

(i) طبعی مشکلات (Physical Obstacle)

انسان ایک طبعی ماحول میں رہتا ہے یہ طبعی ماحول اس کے مقصد کی حصول یابی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔مگر کبھی کبھی یہ طبعی ماحول اس کے راستے میں رکاوٹ حائل کر دیتے ہیں مثلاً دسویں جماعت میں بچوں کا پسندیدہ استاد بہت ہی دلچسپ سبق پڑھانے کے لیے آڈیو وژول (Audio-visual) درس و تدریسی اشیا پروجکٹر کا استعمال کر رہا ہے بھی بچے دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں درس و تدریس کا عمل خوشگوار ماحول میں بہت ہی کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے مگر اچانک بجلی چلی جائے تو اس وقت بچوں کو جو احساس ہوگا وہی مایوسیت ہے۔اسی طرح بچوں کی عزیز شے کا ٹوٹ جانا یا کھو جانا یا اس چیز کو حاصل نہ کر پانا ایسے طبعی حالات ہیں جو بچوں کے اندر مایوسیت پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

(ii) نفسیاتی مشکلات (Psychological Obstacle)

ادب اور آرٹ کے اپنے نفسیاتی تجرباتی نظریہ میں ماہرین نفسیات سگمن فرائڈ نے صاف صاف ذکر کیا ہے کہ مایوسیت مصور، مصنف اور شاعر کو لاعلمی کے طور پر تخلیقی کام میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ کچھ بچے بچپن سے ہی اپنے مقصد کی حصولیابی میں بہت ہی دلچسپی اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔جن کے لیے درکار صلاحیت ان کے اندر نہیں ہوتی ہے۔لیکن ناکامی ان کے اندر ایک ایسا احساس پیدا کر دیتی ہے جن سے ان کے جذبات منفی ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(iii) معاشرتی مشکلات (Sociological Obstacles)

نو بالغ بچے اپنے والدین، دیگر افراد خاندان اور اساتذہ سے تعریف سننے کے خواہش مند رہتے ہیں اگر ان کی اس خواہش کی تکمیل نہیں ہوتی ہے اور ٹوٹے ہوئے خاندان کے بچے جنھیں محبت، شفقت اور سہارا نہیں ملتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بے کار، ناکارہ اور نااہل سمجھنے لگتے ہیں اور مایوسیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔

(iv) حالات کشمکش (Conflict Situation)

بچے جب اپنے ماحول سے مطابقت رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو کشمکش پیدا ہو جاتی ہے کبھی کبھی اکیلے بچے کو دو مقاصد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس طرح وہ ایک سنجیدہ حالات سے گھر جاتا ہے اور حالات کشمکش کے اس مرحلہ میں ذہنی اور جذباتی طور پر بہت پریشان ہونے کے سبب مایوسیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ان سب کے علاوہ افسردگی (Depression) بھی نفسیاتی امراض کی بنیادی وجہ سمجھی جاتی ہے۔ ابتدا میں یہ یاس و مایوسی، حسرت اور ناامیدی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔فرد جب اپنی ناکامیوں سے دوچار ہوتا ہے تو وہ ہمت ہار جاتا ہے اور اپنے آپ کو نااہل و ناکارہ سمجھنے

لگتا ہے۔اس کی یہ کیفیت اس کو زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیتی کیوں کہ اس کے لیے زندگی بے رنگ اور بے معنی ہو جاتی ہے۔ بچہ ہمیشہ اداس اور غمگین رہتا ہے۔ یاس وناامیدی اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے جس سے اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں دن بہ دن کم ہوتی جاتی ہیں۔ جیسے جیسے اس کیفیت کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے فرد پر مریضانہ حالات قابض ہوتے جاتے ہیں اور فرد مختلف قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوتا جاتا ہے جو پہلے خفیف اور پھر شدید شکل اختیار کر لیتے ہیں اور خطرناک علامات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں اور فرد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں فرد جب زندگی سے مطابقت رکھنے میں ناکام رہتا ہے تو خودکشی کو ترجیح دیتا ہے۔

مایوسیت میں گھرے بچوں کے رویہ میں مندرجہ ذیل خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں:

(1) جارحانہ رویہ(Aggressive Behavior)

(2) رجعت پسندانہ رویہ(Fixation Behavior)

(3) ذہنی بالیدگی میں جمود(Regression)

(4) مستعفی حالت (Resignation)

(1) جارحانہ رویہ(Aggressive Behavior)

فرائڈ(Frued,1920) کا کہنا ہے کہ جارحانہ رویہ ذہنی دباؤ کا ایک مظاہرہ ہے۔اس کے مطابق:

"Frustration occurs whenever pleasures-seeking or pain avoiding behavior is blocked."

ذہنی دباؤ کے تصور کی ترقی کا سہرا فرائڈ کے سر جاتا ہے اس نے ذہنی دباؤ(Frustration) اور جارحیت کے درمیان رشتہ ظاہر کیا اور بتایا کہ ذہنی دباؤ کے سبب جارحیت پسندانہ رویہ ظاہر ہوتا ہے اور ذہنی دباؤ کو بڑھاوا ملتا ہے جو ذہنی دباؤ کو ہمیشہ جارحیت کی طرف گامزن کرتا ہے۔ ایک اور ماہرین نفسیات بندورا کا کہنا ہے کہ چڑ چڑا پن، جھگڑالو رویہ، بڑوں کی عزت نہ کرنا، رسم ورواج اور اعتقاد کی طرف منفی ردعمل ظاہر کرنا، ذہنی دباؤ کی علامتیں ہیں۔

(2) رجعت پسندانہ رویہ(Fixation Behavior):

انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ آنے کو رجعت کہا جاتا ہے۔ ذہنی دباؤ کا شکار بچہ زندگی میں کسی بدلاؤ کی خواہش نہیں کرتا اسے اپنی ضرورتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتا ہے۔ کسی کے سامنے جانے سے شرماتا ہے سماجی ربط سے بچتا ہے۔تنہا پسند ہوجاتا ہے اپنے اطراف و اکناف کی چیزوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔

رجعتی حالت میں بچہ تعلیم میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے اسے اپنے علم کو آگے بڑھانے کی خواہش نہیں ہوتی وہ کمرہ اور جماعت میں پیچھے اکیلا بیٹھنا پسند کرتا ہے۔تعلیم میں عدم دلچسپی اس کی ناکامی کا سبب بنتی ہے۔

(3) ذہنی بالیدگی میں جمود(Regression):

ذہنی جمود سے مراد ذہنی بالیدگی کے عمل میں رکاوٹ کا آنا ہے۔ بچے کی ذہنی بالیدگی کے عمل میں رکاوٹ آنے سے ہی وہ عمر کے جس سطح یا مرحلے پر رہتا ہے اس سے پیچھے کے ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے اس کی سوچ کا دائرہ تنگ ہوجاتا ہے فیصلہ لینے کے لیے وہ اپنی سوچ کا استعمال نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے فیصلے پر اتفاق کرتا ہے۔

(2) مستعفی حالت(Resignation):

فرائڈ Frued (1993) نے ذہنی دباؤ(Frustration) اور مستفیج رویہ کے مفروضہ کو پیش کیا۔اس کے خیال کے مطابق ذہنی دباؤ بچے کے اندر اس رویہ کو ابھارتا ہے یا فروغ دیتا ہے جو اس کے موجودہ سطح سے پہلے کے تھے۔ایسا مانا جاتا ہے کہ ذہنی دباؤ کا شکار نو بالغ، بچکانی حرکتیں کرتا ہے وہ بچوں کے ساتھ انھیں کی طرح کھیلنا پسند کرتا ہے اور گھر کے بڑوں سے بچپن کے ایام کی طرح پیار پانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس کا اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، پرانے دنوں کو سوچتا رہتا ہے۔حد سے زیادہ خیالی پلاؤ بناتا ہے۔ بچہ پڑھنے سے زیادہ اور اپنی اوقات سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کا خواب دیکھتا رہتا ہے اور خیالوں میں انعام حاصل کرتا رہتا ہے اور مبارکباد بھی وصول کرتا ہے۔

ذہنی دباؤ کی قوتِ برداشت(Frustration Tolerance):

ہر انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلہ پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کی خواہش کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹیں آتی ہیں۔مگر ہر بچہ ذہنی دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔عدم مطابقت کا مسئلہ ہر کسی کو نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر ناکام بچہ شدید جارہانہ رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اکثر دیکھنے کو ملتا ہے دسویں جماعت میں بہت سے طلبا ناکام یعنی فیل (Fail) ہو جاتے ہیں۔جس کے سبب بعض پڑھائی ترک کر دیتے ہیں بعض تعلیم جاری رکھتے ہیں مگر عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں، بعض اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں اور بعض خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ اس اختلاف کی

وجہ ذہنی دباؤ کی قوتِ برداشت ہے لہٰذا بچے کی ذہنی دباؤ کا مظاہرہ کرنے کی نوعیت اس کی قوتِ برداشت کی سطح پر منحصر ہے۔

مایوسیت اور طلبا کی تعلیمی تحصیل کے درمیان رشتہ

(Relationship between Frustration and Academic Achievement of Students)

مایوسیت میں مبتلا بچوں کے سمجھنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے اور یادداشت کمزور ہوجاتی ہے۔ ایسے بچے جماعت میں پڑھائے جانے والے سبق کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں اور شرمیلے پن کی وجہ سے اپنے شک وشبہات کو دور کرنے کے لیے سوالات پوچھنے میں ہچکچاتے ہیں۔ اپنے آپ کو کمزور سمجھنے لگتے ہیں۔ اچھی تعلیمی تحصیل کی حصولیابی کے لیے کوشش بھی نہیں کرتے اور اپنی تعلیمی تحصیل کا ذمہ دار قسمت کو ہی مانتے ہیں۔

میں نے 2013 میں شہر حیدرآباد کے ثانوی اسکول کے بچوں کی مایوسیت اور تعلیمی تحصیل کے درمیان رشتہ عنوان کے تحت تحقیقی کام انجام دیا۔ جس کا مقصد حیدرآباد کے ثانوی مدارس کے بچوں کی تعلیمی تحصیل اور ذہنی دباؤ کے درمیان رشتہ معلوم کرنا اور حیدرآباد کے ثانوی مدارس کے لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان ذہنی دباؤ کی سطح کے فرق کو معلوم کرنا تھا۔ اس تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ تعلیمی تحصیل اور ذہنی دباؤ کے درمیان منفی رشتہ ہے۔ یعنی کہ بچوں میں ذہنی دباؤ کی سطح جتنی اونچی ہوگی اس مخصوص بچے کی تعلیمی تحصیل کی سطح اتنی ہی نیچی ہوگی۔ اس کے برخلاف ذہنی دباؤ کی سطح نیچی ہونے پر تعلیمی تحصیل کی سطح اونچی ہوتی ہے اور دوسرا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی ذہنی مایوسیت کی سطح اونچی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تعلیمی تحصیل کے میدان میں لڑکیاں لڑکوں کے مقابلہ پیچھے رہتی ہیں اور عورت کی تعلیم ہمارے معاشرہ کے لیے بہت ہی اہم ہے کیوں کہ ایک تعلیم یافتہ عورت معاشرہ کو کامیاب شہری بناتی ہے جو ملک کی ترقی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

جس کی تعلیم کی اتنی زیادہ اہمیت ہے تو بھلا ہم کیوں نہ ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیں۔ ان میں مثبت سوچ و مثبت رویہ کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ انھیں مایوسیت سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے جس کے لیے ہمیں ان کی خوشیوں اور خواہشوں کو اہمیت دینا چاہیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنا چاہیے۔ دونوں کو مساوی عزت دینا چاہیے۔ ان کے کسی بھی اچھے کام سے خوش ہوکر تعریف کرنا چاہیے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ کسی غلطی پر ڈانٹنے کے بجائے پیار سے سمجھانا چاہیے۔ کامیابی قسمت کے ساتھ ساتھ محنت کا بھی پھل ہوتی ہے اس بات کا یقین دلانا چاہیے بلکہ ڈاکٹر علامہ اقبال کے اس شعر کو ذہن نشین کرانا چاہیے

تدبیر کے دستِ زریں سے تقدیر درخشاں ہوتی ہے
قدرت بھی مدد فرماتی ہے جب کوشش انساں ہوتی ہے

محنت ہی کامیابی کی ضامن ہے اس بات کا یقین دلانا چاہیے۔ مسلسل ترقی کی راہ میں گامزن رہنے کے لیے اکسانا چاہیے۔ اکیلے رہ رہے تنہا پسند بچوں کو دوستوں کے ساتھ رہنے کا موقع دینا چاہیے کیوں کہ نفسیاتی جز کی دخل اندازی کے بنا عمل میں تبدیلی نہیں آتی اور عمل میں تبدیلی کے بنا نفسیاتی جز میں تبدیلی نہیں آتی۔

کتابیات:

1) احمد کلیم الدین جامع انگلش۔اردو ڈکشنری نیشنل کاؤنسل فار پروموشن آف اردو لینگویج، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن منسٹری آف ہیومن ریسورسیس اینڈ ڈیولپ منٹ گورنمنٹ آف انڈیا۔
2) بھارگوا مہیش کوٹیا ابر جلتا و یک بھارگوا ماڈرن سائکالوجی اینڈ ہیومن لائف راکھی پرکاشن آگرہ۔
3) یوگیندر کے شرما سائکالوجکل فلاسفی آف ایجوکیشن کنشکا پبلیشرس اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی
4) بارلاک الیڈ ابیتھ (2006) ڈیولپ مینٹل سائکالوجی V ایڈیشن ٹاٹا ایم سی راہل پبلیشنگ نئی دہلی۔
5) این فرید مسرت زمانی (2001) تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔
6) این فرید مسرت زمانی (2005) تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔
7) پروفیسر خان، محمد شریف (2006) جدید تعلیمی نفسیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔
8) بیگ مرزا شوکت (2012) نفسیاتی تعلیم ڈیکن ٹریڈرس حیدرآباد۔
9) پروفیسر جارج جی تھامپسن، چائلڈ سائکالوجی، سرجیت پبلیکیشن، دہلی۔

□□□

Shaista Parveen
Guest Faculty (Education) DDE
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032 (Telangana)

تبسم بانو شاہ

امرتا پریتم کے ناول ’پنجر‘ میں عورت کا کردار

امرتا پریتم پنجابی ادب کا ایک ایسا نام ہے۔ جس کے ادبی شہ پاروں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ادبی دنیا میں بطور ناول نگار، کہانی کار، شاعرہ اور صحافی کے طور پر جانی جاتی ہیں۔

امرتا پریتم 31، اگست 1919 کو دریائے چناب کے کچھ فاصلے پر گجرانوالہ پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام کرتار سنگھ اور والدہ کا نام راج بی بی تھا۔ کرتار سنگھ گوجرانوالہ کے ایک اسکول میں ٹیچر تھے۔ امرتا کے والد شادی سے پہلے ایک آشرم میں پناہ گزیں تھے انھوں نے شادی کے بعد آشرم کو خیر باد کہہ دیا۔ موصوفہ کے والد ادبی ذوق و شوق رکھتے تھے جن کا ادبی سرمایہ ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھا۔ ابھی امرتا کی عمر گیارہ برس کی تھی کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کی موت کے بعد امرتا کا بچپن اپنے والد کے ہمراہ ہی گزرا۔ انھوں نے پنجابی اپنے والدِ محترم سے ہی سیکھی۔ کرتار سنگھ مذہبی انسان تھے وہ اکثر مذہبی پروگراموں میں جاتے تو امرتا بھی ان کے ساتھ ساتھ رہتیں۔ ان کے والد کو یہ ہرگز پسند نہ تھا کہ امرتا غیر مذہبی شاعرہ بنے۔ لیکن ماں کی ممتا بھری یاد اور زندگی کی تنہائی نے ان کے معصوم دل کو مغموم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں جذبات کا ایک لاوا ان کے اندر جمع ہونا شروع ہوا جو ایک دن آتش فشاں کی مانند پھٹ پڑا اور کاغذوں پر شاعری کی شکل میں بکھر گیا۔ اس طرح امرتا نے اپنے والد کے برعکس اپنا ادبی سفر طے کرنا شروع کیا۔ اس ضمن میں وہ اپنی کتاب ’’کرچی کرچی لکیریں‘‘ میں رقمطراز ہیں:

’’اس کے والد نے رعب دار لہجے میں پوچھا؟ یہ نظم تو نے لکھی۔ نہیں میں نے نہیں لکھی۔ میری سہیلی نے لکھی ہے۔ مجھے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ ہونٹ بھی کانپنے لگ گئے۔ والد نے میرے کانپتے ہوئے ہونٹوں میں میرے جھوٹ کو پکڑ لیا اور میرے بائیں رُخسار پر پورے زور سے تھپڑ رسید کر دیا۔ جھوٹ بولتی ہو یہ نظم تم نے لکھی ہے۔ منہ سے کچھ نہ بولا گیا۔ یہ راجن کون ہے؟ پتہ نہیں ...... میں نے در حقیقت سچ بتایا مگر انھیں یقین نہیں آیا۔ انھوں نے اگلے پل ہی میرا لکھا ہوا کاغذ ریزہ ریزہ کر دیا اور میں روتی ہوئی اسکول چلی گئی۔ اس طرح میں اپنی پہلی نظم لکھ کر دوسرے کے نام چھپوانا چاہتی تھی

لیکن دوسرے کا نام برداشت نہیں ہوا بلکہ اس کے عوض
مجھے تھپڑ کھانا پڑا۔"

(امرتا پریتم 'کرچی لکیریں'، صفحہ 17)

امرتا پریتم نے پہلے کلاسیکل ناچ اور سنگیت کی طرف رجوع کیا لیکن ان کے والد محترم کی پابندیوں کی وجہ سے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور لکھنے کی طرف مصروف رہنے لگیں۔ وہ کتابوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جڑ گئیں۔ امرتا کی ملاقات تقسیم سے پہلے ساحر لدھیانوی سے ہوئی وہ دل وجان سے ان سے محبت کرنے لگیں جس کا ذکر انھوں نے اپنی بہت سی کتابوں اور نظموں میں کیا ہے۔ لیکن یہ محبت پروان نہ چڑھ سکی کیونکہ ان کے درمیان مذہب کی دیوار تھی۔ امرتا کی شادی پریتم سنگھ سے ہوئی۔ شادی کے بعد امرتا نے اپنا نام امرتا پریتم لکھنا شروع کردیا۔ 1936 میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ لاہور چلی گئیں۔ گھر والوں کی مرضی کی شادی کو امرتا دل سے قبول نہیں کرسکیں جس کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی گھٹن بھری رہی اور جس کے نتیجے میں 1960 میں دونوں کے درمیان طلاق ہوگیا۔

1947 میں امرتا پریتم نے ملک کا بٹوارہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ان کا حساس دل یہ سانحہ دیکھ کر تڑپ اُٹھا جس کی وجہ سے ان کے قلم نے ایک ایسی نظم لکھی جو آج پنجابی شاعری کا عظیم سرمایہ بن گئی ہے۔

آج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی تو لِکھ لِکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

امرتا پریتم کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کو بے شمار اعزازات وانعامات سے نوازا گیا۔ وہ ہند کی پہلی خاتون قلم کار تھیں جن کو 1945 میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ 1969 میں انھیں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا اور دلی یونیورسٹی، جبل پور یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی اعلیٰ ڈگریاں عطا کی گئیں۔ 83 سال کی عمر میں امرتا چلتے چلتے گر پڑیں اور آہستہ آہستہ چلنے پھرنے کی ہمت ختم ہوگئی۔ امروز مرتے دم تک سائے کی طرح امرتا کے ساتھ رہا۔ 2005 میں وہ اس جہانِ فانی سے رُخصت ہوگئیں۔

امرتا پریتم نے تقریباً 60 سال اپنا قلمی سفر جاری وساری رکھا۔ ان کی بعض کتابوں کا ترجمہ دیگر زبانوں میں بھی کیا جاچکا ہے۔ ان کی تمام تصانیف کا ذکر کرنے کے لیے کئی صفحات درکار ہیں۔

یوں تو امرتا پریتم نے کئی پنجابی ناول تخلیق کیے ہیں۔ لیکن جو مقبولیت ان کے ناول "پنجر" کو نصیب ہوئی وہ ان کے کسی دوسرے ناول کو نہیں ملی۔ ناول "پنجر" امرتا پریتم کا ایک شاہکار ناول ہے۔ ناول "پنجر" ہندوستانی ادب کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ جس کے تراجم دنیا بھر کی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ خشونت سنگھ اور فرانسیسی میں ڈینی ماترنگ نے کیا ہے۔

2003 میں اس ناول پر ایک ہندی فلم "پنجر" بنائی گئی جس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ فلم ادبی وفلمی دنیا میں چرچے کا موضوع بنی۔ اس فلم میں اہم کردار ارملا ماتونڈکر، منوج باجپائی اور سنجے سوری وغیرہ نے ادا کیے۔ فلم "پنجر" بہت زیادہ مقبول ہوئی اور اس فلم کو اس سال کی بہترین فیچر فلم کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

اردو میں پنجر ناول کو کئی قلم کاروں نے ترجمہ کیا ہے ابھی تک یہ ثابت نہیں ہو پایا ہے کہ اس کا اصل ترجمہ نگار کون ہے؟ یا پہلے کس نے ترجمہ کیا ہے؟ بہرحال سردست ترجمہ کردہ ناول "پنجر" پر ترجمہ نگار کا نام درج نہیں ہے۔ یہ 112 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کو 16 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کا انتساب "افضل توصیف" کے نام کیا گیا ہے۔ یہ ناول سیمانت پرکاشن، نئی دہلی کا شائع کردہ ہے جو کہ 2004 میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔

ناول "پنجر" میں سماجی رنگ موجود ہے جو کہ مشترکہ پنجاب کے ہندو، مسلم اور سکھ سماج کی کہانی ہے۔ یعنی اس ناول میں 1947 سے پہلے کے دنوں کے واقعات اور ۱۹۴۷ء کی خونی داستان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول "پنجر" ہندو اور مسلم خاندان کی پرانی دشمنی پر مبنی ہے۔ جس میں مرد سماج کی دشمنی میں دونوں طرف عورت شکار ہوتی ہے۔ ناول کے آغاز میں مندرجہ ذیل جملے اس ناول کی کہانی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ایک بے بس عورت کی کہانی......امرتا پریتم کی زبانی......
عورت جو انتقام کا شکار ہوئی، جو اپنے بطن کے بیٹے کو ماں کا پیار نہ دے سکی، جو تاعمر اپنے گھر، اپنے کنبے اور اپنے منگیتر کو نہ بھلا سکی۔ جس نے تقسیم کی خوں ریزی میں خود کو خطرے میں ڈالا اور دوسری عورتوں کی عصمت وعفت کی حفاظت کی لیکن خود......موقع ملنے پر بھی اپنے بیٹے کی خاطر واپس نہ جاسکی اپنے کنبہ میں، اپنے عزت کے گہوارے میں......"

(ناول "پنجر"، صفحہ 5)

ناول میں امرتا پریتم نے ہندوستانی سماج کے رسم ورواج پر طنز کیا

ہے کہ پاکیزہ سیرت کی مالکہ پارو جب اپنے گھر واپس جاتی ہے تو اس کو کوئی قبول نہیں کرتا۔ ناول نگار نے اس ناول کے ذریعہ ہندوستان خصوصی طور پر پنجابی معاشرہ کی تصویر پیش کی ہے۔ امرتا پریتم کے ناول ''پنجر'' کے بارے میں خورشید احمد لکھتے ہیں:

> ''میں نے تقسیم کے حوالے سے بہت سے رائٹر کی تحریریں (زیادہ تر جذباتی) پڑھ رکھی ہیں لیکن جو مزا اس ناول نے دیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا'' پڑھنے پر کرشن چندر کا ''ان داتا'' ثابت ہوا۔ جبکہ امرتا پریتم کا ناول ''پنجر'' سو فیصد اور یجنل (original) اور غیر جذباتی تحریر ہے۔ یہی کسی بڑے شاہکار یا عالمی ادب کا حصہ بننے والی تخلیق کی سب سے بڑی نشانی ہوا کرتی ہے۔''

(امرتا پریتم نمبر، افضل راز، ص 251)

اس ناول کی کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ''پارو'' نام کی ایک دوشیزہ ضلع گجرات کے ساہوکاروں کی بیٹی تھی۔ اس کی منگنی پاس ہی کے گاؤں رتوال میں رام چندر سے ہو جاتی ہے۔ دونوں کنبے بہت خوش ہیں لیکن شاید یہ قسمت کو منظور نہ تھا۔ اچانک یہ خوشی پرانی دُشمنی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ دُشمنی مسلمانوں اور ہندوؤں کے دو خاندان کے درمیان دو نسلوں سے چلی آ رہی تھی۔ رشید نامی ایک مسلمان لڑکا، ہندو پریوار کی لڑکی پارو کو اغوا کر کے لے جاتا ہے اور اس سے نکاح کر لیتا ہے اور اس کا نیا نام ''حمیدہ'' تجویز کر کے اس کے بازو پر گود دیا جاتا ہے۔ پارو، رشید کے ایک بچے ''جاوید'' کی ماں بن جاتی ہے۔ اسی دوران گاؤں میں رہنے والی ایک پگلی حاملہ ہو جاتی ہے۔ ایک روز پارو پگلی کو ایک درخت تلے پڑی نظر آتی ہے۔ قریب جا کر پتہ چلتا ہے وہ ایک لڑکے کو جنم دیتے ہوئے مر چکی ہے۔ پارو لڑکے کو گود لے لیتی ہے لیکن کچھ عرصے بعد پارو سے بچہ چھین لیا جاتا ہے۔ کیونکہ مذہبی ٹھیکیداروں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پگلی تو ہندو ہے اس لیے مسلمان اس بچے کی پرورش نہیں کر سکتے لیکن بچے کو جب ہندو عورت کے حوالے کر دیا جاتا ہے تو بچے کی طبیعت کچھ ہی دنوں میں خراب ہو جاتی ہے۔ جس پر بچہ پارو کو واپس مل جاتا ہے۔ پارو کی دلی تمنا تھی کہ وہ رام چندر کو زندگی میں ایک بار ضرور ملے جو اس کا منگیتر تھا۔ اچانک رشید کی ایک رشتے دار خاتون کی بینائی چلی جاتی ہے اور پارو کو رام چندر کے گاؤں جانے کا موقع ملتا ہے۔ وہ وہاں رام چندر سے ملتی ہے لیکن پارو رام چندر کو دیکھ کر چلی جاتی ہے۔ پھر ایک دن یہ خبر آتی ہے کہ رشید کے کھیتوں میں پارو کے بھائی نے آگ لگائی ہے۔ پارو کو جہاں اپنے خاوند کے نقصان کا دُکھ ہوتا ہے وہیں دل میں یہ خوشی بھی ہوتی ہے کہ کسی نے اس کا بدلہ تو لیا۔ گھر کے کسی فرد کو پارو یاد تو ہے وہ خوشی کے مارے پھولے نہ سمائی۔ انھیں دنوں ملک کے بٹوارے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ پارو کے گھر کے سامنے سے نقل مکانی کرنے والوں کا ایک قافلہ گزرتا ہے اور پارو قافلے میں لوگوں کی مدد کرتی ہے اس قافلے میں اس کی ملاقات دوبارہ رام چندر سے ہوتی ہے۔ رتوال سے نقل مکانی کے وقت رام چندر کی بہن غائب ہو جاتی ہے۔ پارو دل و جان سے اس کی تلاش میں لگ جاتی ہے اور آخر کار اس کو ڈھونڈھ نکالتی ہے اور رشید بھی قدم قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے تاکہ اس کے گناہوں کا ازالہ ہو سکے اور آخر میں ایک اہم موڑ سامنے آتا ہے۔ پارو کا بھائی اور رام چندر پارو کو اپنانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن پارو ایک وفادار بیوی اور ماں بن کر یہ تجویز ترک کر دیتی ہے اور ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

'ناول " پنجر " پارو کے ارد گرد گھومتا ہے. اس ناول میں پارو نے ایک بیٹی، بیوی، بہن یعنی عورت کے سبھی روپ ادا کیے ہیں۔ پارو تہذیب یافتہ، محنتی، خُداترس اور سب کو معاف کرنے والی خاتون ہے۔ ناول میں امرتا نے پارو کو ایک ایک پنجر (skelton) یعنی ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر پیش کیا ہے'

یوں تو اس ناول میں بہت سے کردار ہیں جیسے پارو (حمیدہ) رشید، رام چندر، رجو، تارہ، کمو، پگلی وغیرہ۔ لیکن اس ناول کا مرکزی کردار پارو ہے جو ناول میں اول سے لے کر آخر تک جلوہ افروز رہتی ہے۔ اس ناول میں امرتا پریتم نے عورت کی درد بھری کہانی کو اس طرح سے پیش کیا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ ناول میں امرتا نے دو پہلو بیان کیے ہیں ایک طرف دُشمنی کا بدلہ اور دوسری طرف تقسیم کے سانحہ کا اور دونوں حالات میں عورت کو ہی قربان ہونا پڑتا ہے۔ امرتا نے تقسیم کے واقعات کو بڑی نزدیکی سے دیکھا تھا جس کی وجہ سے ان کے قلم سے یہ موضوع اُبھر کر سامنے آیا۔ ناول ''پنجر'' بھی انھیں واقعات پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں رسیدی ٹکٹ میں امرتا لکھتی ہیں:

> ''گو قدیم تواریخ کے بڑے ظلم و ستم سے بھرے ابواب ہم لوگوں نے پڑھے ہوئے تھے، پھر بھی ہمارے ملک کی تقسیم

کے موقعہ پر جو کچھ ہوا، کسی کے تصور میں بھی اس قسم کا خونیں باب نہیں آسکتا۔غم والم کے افسانے کہہ کہہ کر لوگ تھک گئے تھے،لیکن یہ افسانے عمر سے پہلے ختم ہونے والے نہ تھے۔میں نے لاشیں دیکھی تھیں،لاشوں جیسے لوگ دیکھے تھے۔" (رسیدی ٹکٹ،امرتا پریتم،ص29)

> ’عورت کو خُدانے صبر و تحمل کی دیوی بنا کر اس دُنیا میں بھیجا ہے پارو اس کی زندہ مثال ہے۔ را ت کے اندھیرے میں رشید کے چنگل سے آزاد ہو کر اپنے گھر واپس لوٹ آتی ہے تو اس کے ماں باپ واپس جانے کو کہتے ہیں وہ احتجاج کرنے کے بجائے وہاں سے چلی جاتی ہے اور اپنے والدین کے حکم کی تعمیل کرتی ہے ۔ دوسری طرف رشید سے نفرت کے بجائے خود بخود اپنے غم میں ڈوبتی چلی جاتی ہے وہ کبھی کسی سے کوئی شکایت بھی نہیں کرتی‘

ناول "پنجر" پارو کے ارد گرد گھومتا ہے۔اس ناول میں پارو نے ایک بیٹی، بیوی، بہن یعنی عورت کے سبھی روپ ادا کیے ہیں۔پارو تہذیب یافتہ، محنتی، خُدا ترس اور سب کو معاف کرنے والی خاتون ہے۔ناول میں امرتا نے پارو کو ایک ایک پنجر (skelton) یعنی ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر پیش کیا ہے۔خواتین کسی بھی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔اکثر و بیشتر خواتین کو تقریباً گھریلو زندگی میں عدم وتحفظ کا شکار بنایا جاتا ہے جس کے ذمہ دار مثلاً شوہر، ساس، نند وغیرہ ہوتے ہیں۔غیر شادی شدہ مستورات پر تشدد کے ذمہ داران کے والدین یا بھائی بہن ہوتے ہیں۔اسی طرح پارو کو بھی زندگی سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔پارو اپنے خاندان کی پرانی دُشمنی کے باعث سب کچھ کھو دیتی ہے۔پارو نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اب رشید کو اپنانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔جب رشید، پارو کو اُٹھا لاتا ہے تو پارو رات کے اندھیرے میں اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی ہے۔لیکن پارو کے ماں باپ سماج کے ڈر سے اس کو قبول نہیں کرتے۔پارو کا باپ پارو سے کہتا ہے:

"بیٹی تیری قسمت اب ہمارے بس میں کچھ نہیں پارو کو اپنے باپ کی آواز آئی پارو اپنی ماں سے چمٹی رہی۔ابھی شیخ گھرانے کے آدمی آجائیں گے تو ہمارے کنبے کو ختم کر دیں گے۔ہم تمہیں کہاں رکھیں گے اب تجھ سے کون شادی کرے گا تیرا دھرم گیا' تیرا جنم گیا۔اب یہاں سے چلی جا۔"

(ناول "پنجر"، ص25)

ان سطروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غیروں کی طرح اپنے بھی عورت پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے ہیں اور پارو کو نہایت افسوس کن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ زہر پی لیتی ہے اور رشید کے پاس چلی جاتی ہے۔جانثار معین 'اُردو دنیا' میں یوں رقمطراز ہیں:

"ہمارا معاشرہ نسائی حقوق دینے سے قاصر ہے،جس کے مضر اثرات ہیں خواتین کو زندہ در گور کرنا،جسمانی، روحانی، جذباتی، نفسیاتی، اذیت،عصمت دری،جنسی بلیک میلنگ، چھیڑ چھاڑ، ہوس کا نشانہ بنانا، دُشمنی مٹانے کے لیے زبردستی شادیاں کرنا، جائیداد کے حصے سے محروم کرنا، زندہ جلانا اور اشتہار بازی کے لیے استعمال کر کے اس عزت و عفت کا نکالنا۔" (ماہنامہ "اُردو دُنیا" نئی دہلی، ص60)

عورت کو خُدا نے صبر و تحمل کی دیوی بنا کر اس دُنیا میں بھیجا ہے پارو اس کی زندہ مثال ہے۔رات کے اندھیرے میں رشید کے چنگل سے آزاد ہو کر اپنے گھر واپس لوٹ آتی ہے تو اس کے ماں باپ واپس جانے کو کہتے ہیں وہ احتجاج کرنے کے بجائے وہاں سے چلی جاتی ہے اور اپنے والدین کے حکم کی تعمیل کرتی ہے۔دوسری طرف رشید سے نفرت کے بجائے خود بخود اپنے غم میں ڈوبتی چلی جاتی ہے وہ کبھی کسی سے کوئی شکایت بھی نہیں کرتی۔جب رشید کو تیز بخار ہو جاتا ہے تو پارو دن رات رشید کی خدمت میں لگ جاتی ہے اور رشید اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوتا ہے وہ ہر حال میں پارو کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اپنے گناہوں کا ازالہ کر سکے۔لیکن پارو کو اب بھی رات کو سوتے ہوئے اس کی سہیلیاں ملتی ہیں۔وہ دن کی روشنی میں حمیدہ اور رات کی تاریکی میں پارو بن جاتی ہے۔امرتا لکھتی ہیں:

"وہ سپنوں میں ماں باپ کے گھر کھیلتی کودتی، سب ہی اسے پارو پکارتے تھے۔پارو دن کی روشنی میں حمیدہ بن جاتی تھی اور رات کے اندھیرے میں پارو ہوتی تھی۔لیکن وہ سوچتی تھی کہ وہ اصل میں حمیدہ ہے نہ پارو.......وہ صرف ایک ڈھانچہ

ہے۔جس کا نہ کوئی روپ ہے نہ کوئی نام ہے۔"

(ناول "پنجر" صفحہ 27)

اس ناول میں عورت کو سماج میں طرح طرح کے ظلم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پگلی اس ناول کی بے بس عورت کا کردار ہے۔ پاگل ہونے کے باوجود بھی سماج کے ظالموں نے اس کو نہیں بخشا۔ حالانکہ پگلی ایک پاگل عورت تھی وہ دن رات گاؤں میں پھرتی۔ کچھ عرصے کے بعد گاؤں کی عورتوں کو پگلی کا بڑھا ہوا پیٹ نظر آتا ہے اور گاؤں کی سبھی عورتیں اس شرمناک حادثے سے دنگ رہ جاتی ہیں اور پارو اپنا آپا کھو دیتی ہے۔ امرتا لکھتی ہیں:

"وہ کیسا مرد ہوگا۔ وہ کیسا وحشی ہوگا جس نے ایسی پاگل عورت کا یہ حال کر دیا سب عورتیں پھٹکار بھیجتی تھیں۔ سب کا دل خون کے آنسو روتا، پگلی جو حسین تھی نہ جوان تھی۔ جو گوشت کا بے ہوش لوتھڑا تھی۔ ہڈیوں کا ایک لڑکھڑاتا ڈھانچہ تھی۔ مردوں نے اسے بھی نوچ نوچ کر کھا لیا تھا۔ پارو بھی سوچ سوچ کر غم وغصے کی آگ میں جلنے لگتی۔"

(ناول "پنجر" صفحہ 45)

یہاں پر بھی پارو انسانیت کی دیوی نظر آتی ہے اور عورت کے درد کو سمجھتی ہے۔ پگلی ایک درخت کے نیچے ایک بچے کو جنم دیتی ہے اور خود اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتی ہے اور پارو اس کی اولاد کو گود لیتی ہے جیسا کہ اس ناول کی بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کی نفرت ہے بچے کی پرورش میں نہ کوئی ہندو نہ مسلمان نظر آتا ہے لیکن اس میں محبت کا رشتہ خون کے رشتے سے زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ جس طرح پارو ایک فرمانبردار بیٹی، بہن، بیوی نظر آتی ہے اسی طرح شفقت سے بھری ماں کا کردار بھی بخوبی انجام دیتی ہے۔ پارو وقت پڑنے پر سب کی مدد کرتی ہے جب رام چندر کی بہن اغوا ہو جاتی ہے تو پارو اس کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتی اور ناول کے آخر میں پارو ایک وفادار بیوی اور ماں بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب پارو کا بھائی اور رام چندر واپس ہندوستان جانے کو کہتے ہیں پارو انکار کر دیتی ہے اور اپنے شوہر رشید اور بیٹے جاوید کے پاس آجاتی ہے اور یوں عورت کو امرتا پریتم نے پنجر میں اس طرح پیش کیا ہے جو ہمیشہ اپنی خوشیوں کا تیاگ دے کر حالات سے سمجھوتہ کرتی ہے۔

دوسری طرف اس ناول میں امرتا نے ایک ایسی سچائی کو بیان کیا ہے جو صدیوں سے ہمارے سماج میں چلی آرہی ہے۔ اگر کسی کے گھر بیٹیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو اس عورت کو منحوس سمجھا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ لڑکے کے لیے دن رات دعائیں مانگیں جاتی ہیں یہی مثال پارو کے گھر پر ہوتی ہے۔ پارو کی ماں بھی دن رات دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ اس کی تین بیٹیوں کے بعد اس کے گھر میں ایک بیٹا پیدا ہوا اور پارو کی ماں گھر میں بدھو ماتا کی پوجا کرتی ہے کیونکہ گاؤں کی عورتوں کا یقین تھا کہ بدھو ماتا اگر جلدی چلی جائے تو وہ لڑکی بنا دیتی ہے کیونکہ اس کو اپنے شوہر کے پاس جلدی جانا پڑتا ہے اور بدھو ماتا اپنے شوہر کے ساتھ لڑ جھگڑ کر آتی ہے تو فرصت کے ساتھ لڑکا بنا دیتی ہے اور یوں گاؤں کی عورتیں صحن میں گانے لگ جاتی ہیں:

بدھ ماتا رُسّی آویں تے منّی جاویں

(بدھو ماتا روٹھ کے آنا اور خوش ہو کر جانا)

ترکھلاں دی دھاڑ آئی

(تین لڑکیوں کے بعد لڑکا پیدا ہو)

اس کے علاوہ ناول میں جگہ جگہ پنجابی بولیاں اور پنجابی گیت بھی شامل کیے گئے ہیں مثلاً پارو کی ماں اس کی شادی کے بارے میں سوچ کر غمگین ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو امڈ آتے ہیں۔

لادیں تے لادیں کلیجے دے نال مائیے

(کلیجے سے لگا لے اے ماں)

دسیں کے دسیں اک بات نی

(اور اک بات بتا)

باتاں تے لمیاں نی دھیاں کیوں جمیاں نی

(باتیں تو لمبی بیٹیاں کیوں پیدا کیں)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پنجر ایک لازوال پنجابی ناول ہے جس میں ناول کے بہترین عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس ناول کی کامیابی حقیقت نگاری، انسانی زندگی اور عورتوں کے مسائل کو دردمندانہ انداز میں پیش کرنے میں ہے۔ ناول "پنجر" کے ذریعہ امرتا پریتم یہ کہنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اغوا کی ہوئی عورتوں سے ہمدردی کرنے کے بجائے ان کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ امرتا پریتم کا یہ شاہکار ناول نہ صرف مشہور ہے بلکہ مقبولیت کے نئے ریکارڈ بھی قائم کرے گا۔

□□□

Tabassum Bano Shah
Research Scholar
Punjabi Unieristy
Patiala-147002 (Punjab)

نازمین

اردو ادب میں تانیثیت

تانیثی تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے لیے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ لفظ حقوق نسواں، تحریک نسواں، نسائیت یا اس جیسے دوسرے مختلف الفاظ جو عام طور سے عورتوں کے حقوق و شناخت کے اظہار کے لیے اصطلاح کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، وہ انگریزی اصطلاح Feminism کے متبادل نہیں ٹھہرتے۔ یہ ایک تحریک ہے، اس لیے اس لفظ (Feminism) کے لیے اردو میں ''تانیثیت'' لفظ ہی موزوں ہے جو اس تحریک کے اغراض و مقاصد کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

تانیثیت کی تعریف اس کی تاریخ اور اغراض و مقاصد کو عالمی و ہندوستانی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف شوشیالوجی میں تانیثیت کی تعریف ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے کہ:

> "Feminism: a movement that attempts to institute social, economic and political equality between men and women in society and end distortion in the relationship between men and women."

(Gender and religion, Encyclopedia of Society, V.1, p.556)

> ''یعنی ایک ایسی تحریک جو عورت اور مرد کے درمیان سماجی، سیاسی اور اقتصادی برابری کو قائم کرے اور عورت و مرد کے رشتے کی خامیوں کو دور کرے۔''

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں پورے یورپ میں تانیثیت خانگی اختلافات کو پیدا کرنے والا ایک جذباتی مسئلہ بن گئی تھی اور عورتوں کے مسائل اور استحصال کے خلاف احتجاج کے لیے عام طور پر اس لفظ کا استعمال کیا جانے لگا تھا۔ ہر عورت کو اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا حق حاصل کرنے، خود مختاری اور وقار کے احساس کو پورا کرنے اور اس کے تعین کے لیے تانیثی تحریک نے اہم رول ادا کیا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس انقلاب کے بعد ہی عورتوں کے لیے تین اہم فیصلے بھی لیے گئے۔ پہلا عورتوں اور مردوں کے مساوات، دوسرا عورتوں کا معاشی استقلال اور تیسرا صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔

عورتوں کی پہلی تحریک آزادی کا باقاعدہ آغاز برطانیہ اور امریکہ میں 1948 میں ہوا۔ بورژوا جو سماج میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور معاشیات پر حاوی تھے، انھوں نے پریس اور دیگر اداروں کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا۔ جدید تانیثیت میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ایجادات کی کامیابی کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ بقول مشتاق احمد وانی:

> ''مادیت پرست تانیثیت میں جن تصورات اور نظریات کو شامل کیا گیا ہے ان میں ثقافتی، تانیثی نظریہ، اسلامی تانیثی نظریہ اور گاندھیائی تانیثی نظریہ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تمام نظریات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تانیثیت کو انھی نظریات کی روشنی میں پرکھنے سمجھنے کی سعی کی جانی چاہیے۔''

(اردو ادب میں تانیثیت، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، عفیف پرنٹرس، دہلی، 2013، ص 98)

دوسرا اعلانیہ 1880 تا1920 کے عرصے پر محیط ہے۔اسی دوران تاریخی طور پر عورت صلح جویانہ نسوانی میلان کو مسترد کرنے کے لائق ہوجاتی ہے۔ایسی عورت مکمل آزادی کا مطالبہ کرتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد عورتوں کو یہ احساس ہوا کہ بعض ادارے عورتوں کی مکمل آزادی میں رخنے ڈالتے ہیں عورتوں کی مکمل آزادی کے لیے مغربی خواتین نے ایکConvention بلائی جہاں عورتوں کے لیے یہ مانگ رکھی گئی کہ انھیں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے۔مکمل آزادی سے یہ مراد تھی کہ انھیں مردوں کی طرح تعلیم میں برابری کا درجہ حاصل ہو۔

بقول ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:

> ’’قدیم یونان کے علماء کا نظریہ یہ تھا کہ سانپ کے ڈسنے کا علاج ہے مگر عورت کی برائی کا علاج ممکن نہیں ہے۔عورت مرد کی راحت وآرام کو مٹاتی ہے،روح کو بے چین کرتی ہے۔مشہور و معروف فلسفی سقراط نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا میں نے جس بھی مسئلہ پر غور کیا اس کی گہرائیوں کو آسانی سے سمجھ لیا مگر تا حال میں عورت کی فطرت کو سمجھ نہ سکا۔‘‘

(ایضاً،ص58)

تانیثیت کی نئے ادبی نظریہ سازوں نے ادب کے ان تمام سکہ بند معاشرے پر سوالیہ نشانات قائم کیے ہیں۔اس طرح تانیثیت کا مسئلہ نظری اعتبار سے ایک اہم مابعد جدید مسئلہ بھی بن گیا۔ورجینا وولف سے لے کر سیمون دی بوائر تک کے درمیانی وقفے میں ادبی درجہ بندی کے جو مباحث سامنے تھے ان کی حیثیت کہیں طبقاتی اور کہیں نفسیاتی درجہ بندی کی تھی۔مگر ان دونوں دانشور خواتین کی تحریروں نے معاصر تانیثی تصورات کی تشکیل جدید کے لیے نئی بنیادیں فراہم کیں۔

اس تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے کہ ورجینا وولف کی کتاب "A Room of One's Own"اور سیمون دی بوائر کی کتاب "The Second Sex" نے کیوں کر تانیثی نقطۂ نظر کی ضرورت کا احساس دلایا۔چنانچہ بیشتر ادبی تحریروں میں اس تفریق کا عکس اس طرح منتقل ہوا ہے کہ مرد کرداروں کے مقابلے میں عورت کا کردار نصف بہتر کے بجائے نصف کہتر کے نمونے بیان کرتا ہے۔

فہمیدہ ریاض کے مقابلے میں کشور ناہید نے اوّل و آخر ایک تانیثیت پسند ادب اور شاعرہ کی حیثیت سے معاصر شاعرات میں فکری، فنی اور علمی طور پر اپنی شناخت قائم کی ہے۔انھوں نے اپنے تانیثی نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے بالعموم دو طرح کے اسالیب کا انتخاب کیا ہے۔انھوں نے

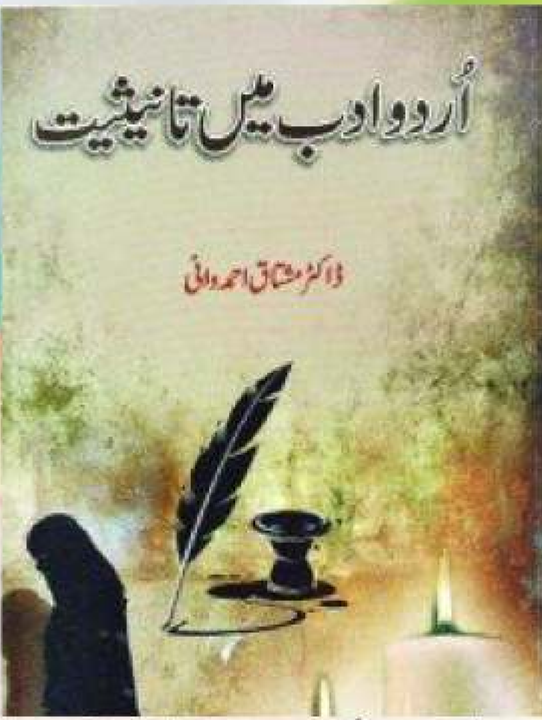

اپنے آپ کو تانیثیت پسند مفکر کے طور پر ہی متعارف نہیں کرایا بلکہ قابل توجہ شاعرہ کی حیثیت سے بھی اپنی اہمیت تسلیم کروائی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ تانیثی تحریک کے تناظر میں کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کو اردو شاعرات کے مابین نمائندہ شاعرات کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔بقول اعجاز الرحمٰن:

> ’’قدیم ادوار میں عورتوں کی حالت پوری دنیا وسماج میں تقریباً ایک جیسی تھی۔مغرب میں عورتیں شروع میں بدحالی کی اور پدرانہ نظام کے امتیازانہ رویے کی شکار تھیں۔چونکہ مغرب میں بیداری پہلے آئی اس لیے جدید نظریات وفلسفے کا بھی آغاز وہیں سے ہوا۔سرمایہ داری کے وجود میں آنے کے بعد انفرادی واجتماعی شعور بیدار تو ضرور ہوا لیکن عورتوں کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔‘‘

(تانیثیت اور قرۃالعین حیدر کے نسوانی کردار، اعجاز الرحمٰن، کلاسک آرٹ پریس، دہلی،ص پیش لفظ)

انسانی تاریخ اور اس کے ارتقا کے سفر کی کہانی مرد یا محض عورت کے وجود سے ممکن نہیں ہوتی۔مرد اور عورت دونوں ہی کا وجود ایک دوسرے کی تکمیل اور بقائے بنی نوع انسان کے لیے ناگزیر ہیں،اس لیے دونوں میں سے کسی ایک کی اہمیت سے انکار کرنا بڑی ناانصافی ہے۔مردوں نے

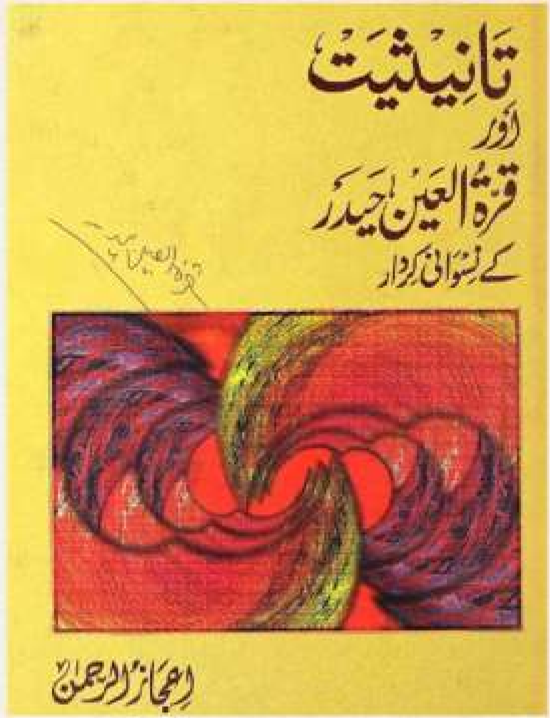

عورتوں کے وجود اور اس کی اہمیت کو قبول کیا بھی تو ذاتی مفاد کی خاطر اور جب کبھی انھوں نے عورتوں کے حقوق کی بات بھی کی تو اس کے پس پردہ عموماً عورتوں کا استحصال تھا۔ جیسے ترقی پسندوں نے عورت کی آزادی کی بات صرف ان کو اپنی تحریک اور فلسفے کی حد تک رہنے کے لیے کی انھوں نے عورت کے آزاد وجود پر توجہ کم کی۔ ان کا ماننا تھا کہ جب سماج میں طبقاتی نظام ختم ہوگا تو عورت کا بھی مسئلہ حل ہو جائے گا جسے تانیثی اسکالروں نے نہیں مانا۔

تانیثی تحریک کا آغاز انیسویں صدی سے مانا جاتا ہے۔ اس سے پہلے حقوق نسواں کے تعلق سے سیاسی سرگرمیاں نہیں تھیں۔ شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ تاریخ میں ہمیں عورتوں کی سیاسی سرگرمیوں کے موضوعات کے ٹھوس ثبوت نہیں ملتے۔

قرۃ العین حیدر (جو بظاہر ادب میں لیڈیز کمپارٹمنٹ کے خلاف رہیں) کے تانیثی تصور پر غور کرتے ہیں تو لازمی طور پر ہمارے ذہن میں اس عہد کی اردو فکشن نگاری کا خاکہ ابھرنے لگتا ہے جس نے اپنی تحریروں میں اس دور میں عورتوں کی اس بیداری اور کرب کے ابھرتے احساس و شعور کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جو مغرب میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

اردو فکشن کی تاریخ پر اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی عورتوں اور ان کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے کسی حد تک عورتوں اور ان کے مسائل کو دیکھنے، پرکھنے اور محسوس کرنے کے طریقۂ کار میں کچھ تبدیلی رونما ہوئی۔ منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی جیسے فنکاروں نے بڑی بیباکی سے عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا۔ بقول اعجاز الرحمٰن:

> ”بس اسے مردوں کی طے کی ہوئی حدوں میں کٹھ پتلی کے مانند دوسروں کے اشاروں پر گھومنا پڑتا ہے اور اس عمل میں ان کے ساتھ جو ناانصافیاں ہو رہی تھیں اسے ہی زیادہ تر افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تحقیقات کے مطالعے سے عورتوں پر ہو رہے مظالم اور ان کے دکھ درد کا احساس تو ضرور ہوتا ہے۔“

(ایضاً، ص 67)

قرۃ العین حیدر کو محض تانیثیت کے دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا مگر ان کے ناولوں اور افسانوں کے فکری اور فنی امتیازات میں عورت کے مقدر، اس کی مجبوری اور اس کے استحصال کو خصوصی ترجیح دے کر اپنا ایک موضوع بنایا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے بعض ناولوں میں ازمنۂ قدیم سے لے کر جدید عہد تک عورت کے مختلف روپ کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش تانیثی تحریک ہے جس کے شعور کے بغیر یہ تحریک جنسی تفریق اور استحصال کا تاریخی سیاق و سباق حاصل نہیں کر سکتی۔ ”آگ کا دریا“ میں چمپا کا کردار حقیقت کے اسی تسلسل کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چمپا ہندوستانی عورت کی نمائندگی کرتی ہے۔

اردو افسانے میں تانیثیت کے حوالے سے جو خاتون افسانہ گار اپنی ایک منفرد پہچان اور بلند مرتبہ حاصل کر چکی ہیں وہ عصمت چغتائی ہیں۔ وہ ابتدا سے ہی ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہیں۔ خواتین میں انتہائی بے باک ہونے کی وجہ سے سماجی برائیوں اور مردانہ تسلط اور ظلم و زیادتی کے خلاف اپنا قلمی جہاد تادمِ حیات جاری رکھا۔

Nazmeen
Research scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ)

ادھوری نشانی

جہاں ماحول میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، وہیں انسان کے ارادے بھی بدلتے ہیں۔ ایک نقش ذہن سے مٹتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ ابھرتا ہے۔ ایک چیز فنا ہوتی ہے تو فوراً ہی دوسری اس خلا کو پر کر دیتی ہے۔ لیکن بعض آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔ عادل جو دور دراز کا سفر طے کر کے پی ایچ ڈی کرنے ایک ایسی یونیورسٹی میں آیا جو مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے۔

عادل کی پی ایچ ڈی کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ اس دوران اچانک اس کی ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوگئی جو بڑی بھولی اور معصوم تھی۔ اتفاق سے وہ بھی پی ایچ ڈی اسکالر تھی۔ بڑا اچھا ساتھ ملا۔ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے۔ عادل اس پر زیادہ مہربان تھا اور بھولی بھالی شاذیہ بھی خوش تھی۔

عادل پڑھنے میں کافی ہوشیار تھا غرض یہ کہ اس نے اپنے آپ کو باصلاحیت ریسرچ اسکالر ثابت کر دیا۔ پروفیسر بھی بڑے خوش تھے۔ وہ تمام پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ کانفرنس اور سیمینار میں وہ سرگرم رہتا۔ بحث و مباحثے میں بھی وہ سب سے آگے رہتا تھا۔ اس طرح اس نے اپنی لگن اور محنت سے پی ایچ ڈی مکمل کر لی۔

شاذیہ کا کام ابھی کچھ باقی تھا۔ عادل نے اس کی بھرپور مدد کی۔ بہرحال وہ دن بھی آ گیا جب شاذیہ کی بھی پی ایچ ڈی مکمل ہوگئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ وہ ذہین بھی بہت تھی۔ اس کا سارا وقت پڑھنے لکھنے میں ہی گزرتا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

عادل اپنی پڑھائی کے دوران کبھی اپنے وطن نہیں گیا۔ اکثر لوگ پوچھتے کہ ارے عادل کیا تمھیں اپنے گھر والوں کی یاد نہیں آتی۔ عادل کا جواب یہی ہوتا کہ یہاں میرا دل اتنا لگ گیا ہے کہ میں تو سب کو بھول ہی گیا۔ بس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں ہمیں بہت کچھ ملا۔ علم کی دولت اور بہت کچھ۔

عادل کو خوش نظمی اور ہردلعزیزی جس قدر حاصل تھی کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

وہ بہت جلد ہی یہیں لیکچرر کے عہدے پر بھی فائز ہوگیا۔ اب کیا تھا۔ اسے سب کچھ مل گیا۔ اس لمبے عرصے میں وہ اپنے گھر کبھی نہیں گیا۔ نہ جانے کیوں؟

اس کے دل میں جو خواہش تھی۔ اس نے اپنی اس خواہش کو دبا رکھا تھا مگر کب تک؟ محبت کا غیر ارادی طور پر بویا ہوا بیج غیر محسوس طریقے سے کافی عرصے سے عادل کے دل میں بالیدگی پا رہا تھا۔

اب تک دونوں اپنی اپنی عمر کی رفتار کے ساتھ اس خاموش پہچان کی بھی توثیق کرتے جا رہے تھے۔ جس کا تعلق نطق زبانی سے نہیں صرف دل و دماغ سے ہے اور پھر ایک کا دوسرے کی طرف کھنچنا یقینی تھا جبکہ دونوں نے ساتھ تعلیم حاصل کی اور زندگی کا زیادہ حصہ ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزارتے رہے۔

ایک روز عادل نے شاذیہ کے سامنے اپنی اس دبی خواہش کا اظہار

'عادل پر اسے بہت اعتبار تھا۔ اس نے سوچا زندگی شادی کے بعد خوشگوار گزرے گی۔ عادل کے اندر وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہیے۔ اتنی خوبیاں تو کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عادل اور شاذیہ کی شادی ہو گئی'

کر ہی دیا۔ شاذیہ بھی سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ مگر اسے فیصلہ لینے میں کافی وقت گزر گیا۔

عادل پر اسے بہت اعتبار تھا۔ اس نے سوچا زندگی شادی کے بعد خوشگوار گزرے گی۔ عادل کے اندر وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہیے۔ اتنی خوبیاں تو کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عادل اور شاذیہ کی شادی ہوگئی۔

خوشی کا ماحول تھا— جبکہ عادل شاذیہ سے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ میرا کوئی نہیں ہے، میں تنہا ہوں......تم یقین کرو......

لیکن......اچانک شاذیہ کو یہ خبر کہیں سے ملی کہ عادل کی تو پہلے شادی ہوچکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے دو بچے بھی ہیں۔

شاذیہ کو کیا معلوم تھا کہ یہ خبر خون جگر کے لیے زہر کا پیالہ بن جائے گا۔ شاذیہ نے دیکھا کہ عادل کی پہلی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ اس کے سامنے دامن پھیلائے ہوئے رحم کی بھیک مانگ رہی ہے۔

مجھ پر رحم کریے۔ میں اپنی پہاڑ جیسی زندگی ان بچوں کے ساتھ تنہا کیسے گزاروں گی۔ ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ کس طرح اٹھاؤں گی۔ میں تو نوکری بھی نہیں کرتی۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں، نوکری بھی کرسکتی ہیں۔ میں کیا کروں گی، کہاں جاؤں گی۔ میرے والدین بھی حیات نہیں رہے۔ میں تنہا ہوگئی......ان بچوں کی پرورش کیسے کروں گی۔ آپ اس دکھیاری پر رحم کیجیے۔

اسی دوران عادل وہاں آگیا۔ وہ رضوانہ کو وہاں دیکھ کر حیران تھا۔ ساتھ ہی بیحد گھبرایا ہوا کہ اب کیا ہوگا۔ رضوانہ یہاں تک کیسے پہنچ گئی۔

بہرحال وہ تلخ لہجے میں بولا...... یہ سب کیا ہے۔ شاذیہ یہ کون عورت ہے۔ یہاں کیوں آئی ہے۔ کیا بک رہی ہے۔

عادل یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ شاذیہ اپنے غصے کو کسی طرح قابو کرتے ہوئے بولی۔ عادل صاحب......آپ نے عورت کو سمجھ کیا رکھا ہے......کھلونا......جب چاہا کھیلا اور دل بھر گیا تو اٹھا کر پھینک دیا۔ آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیے۔ میں رضوانہ اور اس کے بچوں کا حق اس کو دلوا کر رہوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

رضوانہ تم فکر نہ کرو۔ رونا نہیں۔ رونا بیکار ہے۔ انسان کو ہر حال میں صبر وشکر سے کام لینا چاہیے۔ آدمی مقدر سے مجبور ہے۔

عورت کی فطرت بے وفا نہیں ہوتی۔ رضوانہ کو شاذیہ کی ان باتوں سے بہت سہارا ملا۔

عادل......رضوانہ کو اس کا حق تمھیں دینا ہی پڑے گا۔

رضوانہ خوش تھی۔ مگر کیا عادل نے یہ سوچا ہوگا کہ اس راز کا پردہ فاش ہوگیا تو شاذیہ کا کیا ہوگا......نہیں......اگر عادل نے ایسا سوچا ہوتا تو وہ ایک زندگی کو اس طرح برباد نہ کرتا۔

شاذیہ کے یہ آخری جملے تھے کہ میں گردش قسمت سے لڑوں گی اور اپنی موجودہ حالت کو بدلنے اور مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کروں گی۔ وہ کل جو خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گھر جس کی شاذیہ مالک تھی۔ آج وہ گھر شکستہ نظر آرہا ہے اور شاذیہ اس شکستہ اور بوسیدہ کمرے میں بیٹھی ہوئی اشک خونیں کے قطرات دامن پر بکھیر رہی ہے، جس کے دیوار و در آج بھی اس کی عشرت ماضیہ کے شاہد وسوگوار اور ذرے ذرے دور نشاط وشادمانی کے آئینہ دار ہیں۔

دنیا کا مبہم فلسفہ اس کی نگاہ کے سامنے ہے اور وہ ہمہ تن فکر مند ہوکر اپنی پیچیدہ تقدیر کی گتھیوں کو سلجھانے کی ناکام کوشش میں مصروف ومنہمک تھی۔ اس عرصے میں کتنی ہی بہاریں آئیں اور خزاں میں تبدیل ہوگئیں۔ گھٹائیں کتنی حد تک بے قرار ہوہو کر اس کے حال زار پر روئیں اور ان کے آنسو خشک ہوگئے۔ کتنی ہی راتوں نے اس کے غم میں سیاہ ماتمی لباس پہنا اور آخر کار روز روشن کی جلوہ آرائیوں میں فنا ہوگئیں۔

عورت کا دوسرا نام قربانی دینا ہے۔ شاذیہ اپنی اس قربانی سے خوش تھی کہ اس نے کسی کی زندگی تباہ ہونے سے بچالی۔ شاذیہ کے سامنے عادل کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی حالت اس وقت ایک مجرم سے کم نہ تھی۔

□□□

Dr. Nasreen Begum (Alig)
Assistant Professor
Head Dept. of Urdu
28/390, Binda Ganj
Gudri Mansoor Khan
Agra-282003 (U.P)

نصرت شمسی

بوجھ

محی الدین نے اذان کی آواز سننے کی کوشش کی مگر باہر سے آتی تیز موسیقی کی آواز نے ''اللہ اکبر'' کی صدا کو دبا دیا۔محی الدین نے اپنے کپکپاتے جسم کو کرسی سے اٹھانے کی کوشش کی اور چند منٹ کی محنت کے بعد وہ اپنی کمر کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ضعیفی کی وجہ سے دوہری ہو چکی تھی اور لاکھ کوشش کے بعد بھی سیدھی نہیں ہو پاتی تھی۔ محی الدین نے اپنے رعشہ بھرے ہاتھ سے چھڑی اٹھائی اور آہستہ آہستہ ٹیکتے ہوئے دوروازے کی طرف قدم بڑھائے اور ہولے سے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔باہر ہال میں ان کی ساتوں اولادیں رقص و موسیقی کے سرور میں ڈوبی ہوئی جھوم رہی تھیں۔آج ان کے پوتے کی ساتویں سالگرہ تھی۔ ماڈرن لباس زیب تن کیے مرد وزن آ رہے تھے اور باہم گلے مل کر ان کے بیٹے کو مبارک باد دے رہے تھے۔خوبصورت سجی سجائی تھالیوں میں بیرے انواع و اقسام کے کھانے لیے ٹہل رہے تھے کیونکہ یہی آج کی پارٹی کا انتظام تھا۔لوگ ٹہل ٹہل کر کھانے نوش فرما رہے تھے اور مصنوعی قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ کتنے خوش تھے آج یہ لوگ! اتنے خوش کہ انھیں پارٹی کی خوشی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ صبح سے ان کا بوڑھا کمزور باپ ایک کمرے میں قید ہے۔وہ زندہ ہے یا مر گیا اور یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہر چھٹے مہینے اس محل نما گھر میں ایسی پارٹیاں ہوتی آئی تھیں، جن میں اسی طرح کے مناظر ہوتے تھے اور محی الدین اسی طرح ایک کمرے میں قید......

محی الدین نے کواڑ بند کیے اور ایک تاسف سا چہرے پر لیے ہلتے ہلاتے اپنی کرسی پر آ گئے۔اپنی بکھری سانسوں کو درست کیا اور پھر وہی کانپتا ہوا ہاتھ میز پر قلم اور ڈائری کی طرف بڑھ گیا۔ڈائری کھولی اور قلم سنبھالا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے بعد اس ڈائری کو کھول کر دیکھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔شاید کسی کو پتہ تک نہ چلے گا کہ ان کے باپ کو ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا مگر پھر بھی وہ ڈائری لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا ضرور کرتے تھے۔ اگرچہ رعشہ اور ضعیفی نے یہ طاقت بھی اب چھین سی لی تھی اور وہ لکھتے کیا ہیں یہ کوئی پڑھ بھی نہیں سکتا تھا مگر حروف کی توڑ جوڑ کو آڑی ترچھی لکیروں کی شکل میں کھینچ کر انھیں کچھ سکون ضرور ملا کرتا تھا اور اسی سکون کی تلاش میں وہ یہ سب کیا کرتے تھے۔انھوں نے ابھی لکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ محی الدین کا ضمیر پھر ضرب کاری کر بیٹھا۔

''کیا لکھو گے؟ محی الدین! اپنی ناکام زندگی یا خدا کی نعمت کے ساتھ نا انصافی، کیا تم نہیں جانتے کہ تمھیں کیا کرنا چاہیے اور تم کیا کر بیٹھے؟! ابھی ہم نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر آزادی کی چند سانسیں بھی نہ لی تھیں کہ ہم سب پھر غفلت کی نیند سو گئے۔ایک تو ملک کے بٹوارے نے ہم سے بہت کچھ چھین لیا اور دوسری ہماری سوچ نے اور ''آج نہیں کل'' کرنے کی ہماری عادت نے وہ کل کبھی آنے ہی نہیں دیا۔محی الدین تم بھی برابر کے گناہ گار ہو، اس قوم کے، اپنے ملک کے اور اس قصبے کے۔''

محی الدین نے آنکھیں بند کر لیں وہ اپنے ضمیر کا سامنا نہیں کر پا رہے تھے۔

''آنکھیں کھولو محی الدین! اور سوچو......کیا تم اپنے قصبے کے، اپنی قوم کے لوگوں کے لیے بہت کچھ نہیں کر سکتے تھے؟ کروڑوں کی

'محی الدین نے کواڑ بند کیے اور ایک تاسف سا چہرے پر لیے ہلتے ہلاتے اپنی کرسی پر آگئے ۔اپنی بکھری سانسوں کو درست کیا اور پھر وہی کانپتاہوا ہاتھ میز پر قلم اور ڈائری کی طرف بڑھ گیا۔ڈائری کھولی اورقلم سنبھالا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے بعد اس ڈائری کو کھول کر دیکھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔شاید کسی کو پتہ تک نہ چلے گا کہ ان کے باپ کو ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا مگر پھر بھی وہ ڈائری لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا ضرور کرتے تھے ۔ اگرچہ رعشہ اور ضعیفی نے یہ طاقت بھی اب چھین سی لی تھی اور وہ لکھتے کیا ہیں یہ کوئی پڑھ بھی نہیں سکتا تھا مگر حروف کی توڑ جوڑ کو آڑی ترچھی لکیروں کی شکل میں کھینچ کرانہیں کچھ سکون ضرور ملا کرتا تھااور اسی سکون کی تلاش میں وہ یہ سب کیا کرتے تھے۔انہوں نے ابھی لکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ محی الدین کا ضمیر پھر ضرب کاری کر بیٹھا'

جائیداد، مال و دولت ، بے شمار زمینیں ،محل جیسے گھر اور بے شمار زیورات کیا نہیں تھا تمھارے پاس؟ مگر تم نے ساری عمر ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کو ہی اپنی شان سمجھا اور......"

"نہیں نہیں ایسا نہیں" محی الدین نے ضمیر کو بہلانا چاہا۔

"میں نے بہت کچھ کیا ہے اس دولت سے ، جو اللہ نے مجھے دی تھی ۔ دیکھو اس قصبے کی عالی شان مسجد کو۔ آج بھی اس کی نظیر نہیں۔ وہ کس نے بنوائی؟ میں نے بنوائی ۔ اپنا لاکھوں روپیہ خرچ کرکے۔ اس کا گنبد سونے کا ہے۔"

"ہاں محی الدین وہ سونا مسجد مگر کیا بس یہی کافی تھا؟ کیا یہی ضرورت نظر آئی تھی تمھیں اپنے لوگوں کے لیے اور باقی بے شمار دولت ، جو تم نے اپنی ساتوں اولادوں کے لیے جمع کرکے رکھی ۔ وہ بھی اتنی کہ انھیں بھی کبھی ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پڑی۔محی الدین سچ تو یہ ہے کہ ہم سب اپنی پسماندگی کا رونا روتے ہیں لیکن اپنے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرتے ، دراصل ہماری سوچ پسماندہ ہے ۔ کیا مسجد پر کروڑوں روپیہ خرچ کرکے ہم وہاں سجدہ کرنے والوں کے سجدوں کی قیمت بڑھا سکتے ہیں؟ محی الدین زمرد کی جائے نماز پر کیا گیا سجدہ اور خاک کے مصلے پر کیا گیا سجدہ برابر ہے۔ مسجدوں کو سونا چاندی قیمتی نہیں بناتے بلکہ عقیدت سے جھکے سر اور نیت قیمتی بناتے ہیں۔ کیا ہوتا اگر یہ مسجد عام سی مسجد ہوتی مگر اس کے بدلے تیرے قصبے میں ایک دانش گاہ ہوتی، ایک گہوارۂ علم......کیا تیری قوم کے بچوں کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ محی الدین دیکھ تیری چھوڑی دولت نے خود تیرے بچوں کو اس مسجد سے دور عیاشی کی دل دل میں ڈبو دیا اگر انھیں ایک درس گاہ ملی ہوتی تو یقیناً ان کی جبینیں آج سجدہ ریز ہوتیں۔ تیرے پاس بے شمار دولت تھی تو کیا سمجھتا ہے کہ ایک مسجد کو قیمتی پتھر سے سجوا کر تو نے اللہ کی دی ہوئی دولت کے ساتھ انصاف کیا اور تیرا معاملہ صاف ہوگیا۔ محی الدین اپنی عمر دیکھ تو اس وقت جوان تھا جب یہ ملک آزاد ہوا اور آج تیری کمر دوہری ہو چکی ہے۔ اتنے عرصے میں اگر تیرے قصبے کے لوگ تعلیم گاہوں میں اپنا قیمتی وقت گزارتے تو آج اس قصبے کے لوگوں کی حالت کیا ہوتی؟ تو ذمہ دار ہے محی الدین، تو نے فکر کی اپنے بچوں کی، اپنے آنے والی عیش بھری زندگی کی اور دیکھ آج تیری ہی اولاد تجھے بھول کر خود میں کیسی مگن ہے۔ قصور تیرا ہے محی الدین، کاش تو نے کچھ کیا ہوتا۔"

محی الدین نے زور سے ڈائری بند کی ۔ اس کی آنکھوں سے عرق ندامت برابر بہہ رہا تھا۔ باہر سے آتی موسیقی کی آواز اور تیز ہوگئی تھی۔ محی الدین نے پھر اپنے تھرتھراتے جسم کو کرسی سے اٹھایا اور ایک بار پھر دروازے کی جانب بڑھا اور ہلکے سے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ پارٹی اپنے شباب پر تھی۔ اس کی تمام اولادیں اور ان کی بیویاں گلاس ہاتھوں میں لیے ڈول رہی تھیں۔ خود پرستی کا نشہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اب ان کے قدم بہکنے لگے تھے ۔ محی الدین نے دروازے کو بند کر دیا جس کے باہر اس کی اولادیں جہالت پر رقص کیے جا رہی تھیں اور محی الدین ضمیر کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔

□□□

Nusrat Shamsi
Anjuman Street
Rampur-244901 (UP)

انزیلہ انصاری

تقدیر

مصعب گہری کالی آنکھوں والا جاذب نظر لڑکا تھا۔ عمر کوئی پچیس چھبیس سال مگر نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ بچپن یتیم خانے میں گزرا۔ نابالغ کا دور پڑھائی کرنے کے لیے محنت میں گزرا اور اب جوانی کا عرصہ نوکری کرنے اور زیادہ تر تنہائی میں گزرتا۔

مصعب بزنس کمپنی میں اکاؤنٹس دیکھتا تھا۔ وہ اتنا کما لیتا کہ آرام سے خود پر خرچ کرکے کچھ بچا بھی لے۔ کمپنی کی طرف سے دیے ہوئے فلیٹ پر رہتا ایک پرسکون زندگی کا مالک تھا مگر خدائے تعالیٰ اپنے ہر بندے کو من چاہی زندگی نہیں دیتا۔ دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی پریشانی اور الجھن میں مبتلا رہتا ہے کیونکہ خدا چاہتا ہے کہ ہر وقت اس کا بندہ اسے یاد کرے۔ اس کا شکر ادا کرے نہ کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں پر خود قادر آ جائے۔

مصعب کی زندگی میں بھی بدلاؤ کی شروعات ہوگئی۔

مصعب اپنی چھوٹی سی کار لیے ہوئے ٹریفک سگنل پر آگے جانے کے انتظار میں تھا۔ سگنل پر بہت سے لوگ اپنے اپنے راستے جانے کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک سگنل سے روڈ پار کرتا ٹو وہیلر پر سوار ایک نوجوان نے سڑک پار کرتی ہوئی بوڑھی عورت کو زخمی کر دیا اور وہ ہواؤں کا رخ بدلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس حادثے کے فوراً بعد سگنل میں ہری لائٹ نظر آنے لگی اور راستے پر کھڑے سارے افراد اس زخمی عورت کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ مصعب یہ دیکھ کر اپنی کار سے اترا اور اس عورت کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ مگر مصعب سے پہلے وہاں ایک لڑکی اس بوڑھی عورت کو

> 'اس واقعہ کے بعد مصعب کی آنکھیں ہر وقت ٹریفک سگنل پر ہوتیں ایسے تو مصعب کا معمول تھا وہ روزانہ اسی سڑک پر سے جاتا مگر کبھی اس لڑکی کی طرف اس نے دھیان نہیں دیا۔ مگر اب روزانہ مصعب کی آنکھیں سڑک پار کرتی اس لڑکی کو تلاشتی اور وہ لڑکی روزانہ اسی راستے سے کہیں جایا کرتی'

سہارا دیے بیٹھی تھی اور ہر آنے جانے والے سے مدد کی گزارش کر رہی تھی۔ مصعب کو قریب آتا دیکھ وہ اس سے بھی مدد مانگنے لگی۔ "پلیز، میری مدد کرو! پلیز" اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مصعب کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا، ہلکی گلابی رنگ کی ساڑی، سیدھے ہاتھ میں کالے باریک بیلٹ کی گھڑی، آنکھوں میں ہلکا کاجل، جمی ہوئی بھنوؤں کے درمیان کالی چھوٹی سی بندی اور گیہواں رنگ۔ مصعب بہت متاثر ہوا اور مصعب نے اس لڑکی کی مدد کی۔

اس واقعہ کے بعد مصعب کی آنکھیں ہر وقت ٹریفک سگنل پر ہوتیں۔ ویسے تو مصعب کا معمول تھا کہ وہ روزانہ اسی سڑک پر سے گزرتا مگر

کبھی اس لڑکی کی طرف اس نے دھیان نہیں دیا۔ مگر اب روزانہ مصعب کی آنکھیں سڑک پار کرتی اس لڑکی کو تلاشتی اور وہ لڑکی روزانہ اسی راستے سے کہیں جایا کرتی۔

حسب معمول مصعب صبح سویرے بیدار ہوا۔ ناشتہ بنایا اور آفس کے لیے تیار ہو کر ناشتہ کیا۔ بلڈنگ کی پارکنگ میں پہنچ کر اپنی گاڑی کو صاف کیا۔ گاڑی کا مکمل طور پر جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ تیسرا ٹائر پنکچر ہے۔ وقت معلوم کیا تو کافی دیر ہو چکی تھی کوئی اور راستہ نہ نکلا اور بس کے ذریعے اپنی منزل پر پہنچ کر راستہ پار کرنے کے لیے سگنل کے انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ اچانک آواز آئی "ایکس کیوز می! مصعب نے اپنی دائیں جانب نظر ڈالی وہ لڑکی ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے کھڑی تھی مگر اس بار اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی پہنی تھی جو اس پر بہت کھل رہی تھی مصعب نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا "جی بولیے۔"

'اس دن آپ نے میری مدد کی تھی، ہے نا؟"

مصعب نے 'ہاں' میں اپنا سر ہلایا۔

'میں آپ کو دھنیہ واد کہنا تو بھول گئی تھی! اس دن میں بہت جلدی میں تھی۔'

مصعب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں! کوئی بات نہیں وہ بزرگ میری ماں کی طرح ہی تھیں۔"

"ہاں مگر اس سمئے میری کوئی مدد بھی نہیں کر رہا تھا...... ویسے میرا نام پریا ہے"

یہ کہہ کر اس لڑکی نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا

مصعب کو جان کر حیرانی ضرور ہوئی مگر مصعب نے پریا کی دوستی قبول کرتے ہوئے ہاتھ ملایا

'میرا نام مصعب ہے۔'

مصعب اچھی طرح جانتا تھا کہ اسلام میں غیر سے میل جول کرنے پر کوئی پابندی نہیں پابندی ہے تو غیروں کی مشابہت سے ہے۔

اس واقعہ کو کئی دن گزر گئے اور آہستہ آہستہ مصعب کو پریا کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ پریا ایک بڑے دوا خانے میں Receptionist کی نوکری کرتی تھی دو بڑے بھائیوں کی اکلوتی اور چھوٹی بہن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر وہ ایک غیر مسلم طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان سب کے باوجود مصعب کو پریا بہت پسند تھی۔

وہ شام کا وقت تھا جب مصعب اور پریا ایک پر سکون ماحول میں جینے کا مزہ لے رہے تھے کہ اچانک مصعب نے پریا سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

'اس رات مصعب پر سکون نیند سویا مگر پریا ساری رات جاگتی رہی ہر کروٹ پر اسے نئی پریشانی دکھائی دیتی۔ سماج میں ہوئی بے عزتی دکھائی دیتی۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھتی اور اس کے منہ سے نکل آتا" ہے بھگوان! اب میں کیا کروں!'

"پریا۔ میں اپنی باقی کی زندگی تمھارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

مصعب کے اس جملے پر پریا حیرت سے مصعب کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایسے مت دیکھو! اس دن سڑک پر بہت سارے لوگ آگے جانے کے انتظار میں کھڑے تھے...... میں بھی ان میں شامل تھا مگر اب لگتا ہے جیسے اسی سگنل پر زندگی آ کر رک گئی ہے...... تم میرے بارے میں جانتی ہو میں تمھارے بارے میں فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے میں تمھیں بہت خوش رکھوں گا پریا...... میں جانتا ہوں کہ تمھارے لیے بہت بڑا فیصلہ ہے مگر جہاں اس وقت میں کھڑا ہوں وہاں مذہب کی نہیں بلکہ جذبات کی زیادہ اہمیت ہے۔"

مصعب کا جملہ مکمل ہوتے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی کچھ دیر تک پریا یونہی مصعب کو دیکھتی رہی اور وہاں سے کچھ کہے بغیر ہی چلی گئی۔

اس رات مصعب پرسکون نیند سویا مگر پریا ساری رات جاگتی رہی ہر کروٹ پر اسے نئی پریشانی دکھائی دیتی۔ سماج میں ہوئی بے عزتی دکھائی دیتی۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھتی اور اس کے منہ سے نکل آتا" ہے بھگوان! اب میں کیا کروں!"

کئی روز گزر گئے۔ ان ہی دنوں مصعب کا پرموشن ہو گیا اور کچھ ہی ہفتوں میں وہ دوسرے شہر منتقل ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ چھٹی والے دن بھی وہ جلدی بیدار ہوا۔ کافی کا مگ لیے اپنی گیلری میں کھڑا صبح کی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہونے لگا سڑکیں خالی تھیں چرند پرند کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گیلری میں رکھے پودوں پر نمی تھی مصعب ان ہی چیزوں کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ اچانک ڈور بیل کی آواز آئی۔ مصعب نے گھڑی دیکھتے ہوئے دروازہ کھولا۔ سامنے پریا کھڑی تھی۔ بال بکھرے ہوئے، لال آنکھیں اور بے ترتیب سا لباس، مصعب نے گھبرا کر کہا" پریا!

'اسی روز پریا نے اسلام قبول کیا اور مصعب کے نکاح میں آ گئی۔ پریا اس وقت ایک نئے احساس کے ساتھ جی اٹھی۔ مصعب نے پریا کا نام تبدیل کر کے انیسہ رکھا'

تم......تم اس وقت"

"ہاں! کیا تم سچ میں مجھے خوش رکھو گے؟"

"ہاں......مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ساری عمر......"

"ہاں......ساری عمر"

"پھر مجھ سے شادی کر لو"

مصعب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر پریا بھی مسکرانے لگی۔

اسی روز پریا نے اسلام قبول کیا اور مصعب کے نکاح میں آ گئی۔ پریا اس وقت ایک نئے احساس کے ساتھ جی اٹھی۔ مصعب نے پریا کا نام تبدیل کر کے انیسہ رکھا۔

نکاح کے ایک ہفتے بعد مصعب اور انیسہ دوسرے شہر منتقل ہو گئے اور اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ مصعب جس بلڈنگ میں رہنے گیا وہاں سائرہ نام کی ایک نیک بخت خاتون اپنی فیملی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ انیسہ اور سائرہ کی دوستی ہو گئی اور انیسہ کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ انیسہ عبادت کرتی اور اللہ کا ہر وقت شکر ادا کرتی۔

شادی کے چند مہینوں بعد انیسہ نے مصعب کو خوش خبری دی کہ وہ امید سے ہے۔ مصعب یہ خبر سن کر بہت خوش تھا۔ اس کی پرسکون زندگی اب خوشیوں سے بھرنے والی تھی یہ خبر سنتے ہی مصعب نے انیسہ سے کہا۔ "جب میں نے ہوش سنبھالا تو معلوم ہوا کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ مگر جب ہمارا بچہ اس دنیا میں آنکھ کھولے گا تو اپنے والدین کے ہاتھوں میں ان کی سرپرستی میں...... مجھے خوشی ہے کہ میرا نام لینے والا کوئی ہو گا اس سماج میں اس دنیا میں......"

انیسہ بہت خوش تھی ایک سال کے بعد انیسہ کے یہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی۔

مصعب نے اپنے بیٹے کا نام ارحام رکھا۔ مصعب اور انیسہ اپنی زندگی میں بہت خوش تھے مگر چند سال گزرنے کے بعد ارحام بیمار رہنے لگا۔

بہت کوششوں اور ہر ممکن علاج کے بعد بھی ارحام کی طبیعت درست نہ ہوئی اور پانچ سال کی عمر میں وہ فوت ہو گیا۔

اس حادثے کے بعد سے مصعب بہت چپ چپ رہنے لگا، انیسہ اور مصعب کی آپس میں بات بہت کم ہو گئی۔ مصعب کی یہ حالت دیکھ کر انیسہ بہت پریشان رہتی۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کے بعد معلوم ہوا کہ انیسہ اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ بہت سوچنے اور سمجھنے کے بعد انیسہ سائرہ کے گھر گئی۔

'السلام علیکم سائرہ باجی'

'وعلیکم السلام ارے انیسہ۔ بہت دنوں بعد آئی ہو۔'

'میں بہت پریشان ہوں باجی...... ارحام کی موت کے بعد مصعب نے مجھ سے ٹھیک سے بات تک نہیں کی، مجھے دیکھ کر مسکراتے بھی نہیں، ماتھے پر بل لیے گھومتے ہیں۔ بہت بوجھل سے اور......اور اللہ کی مصلحت کہ میں اب ماں نہیں بن سکتی اب......آپ بتائیں'

یہ کہتے ہوئے انیسہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

'سائرہ باجی میں مصعب کی شادی کروانا چاہتی ہوں......!'

'مگر......مگر انیسہ......'

انیسہ نے روتے ہوئے کہا 'نہیں باجی میری مدد کیجیے پلیز'

سائرہ نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہے جیسی تمھاری مرضی مگر مصعب......"

"میں انھیں سمجھاؤں گی۔"

دوسرے روز انیسہ نے مصعب سے بات کرنے کی کوشش کی۔ انیسہ کی خواہش سن کر مصعب کچھ دیر تک انیسہ کو گھورتا رہا، یہ دیکھ کر انیسہ نے کہا، "میں جانتی ہوں کہ تمھارا اس دنیا میں کوئی نہیں مگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارا کوئی ہو جو تمھارے ادھورے نسب کو آگے بڑھا سکے۔'

مصعب واقعی میں اولاد کی چاہ رکھتا تھا اس لیے انیسہ کی بات پر غور کرتے ہوئے وہ راضی ہو گیا۔ سائرہ کے کسی دور کے رشتہ دار کی بیٹی صوفیہ تھی جس کی سانولی رنگت، چوڑی پیشانی، بڑی آنکھیں اور پتلے ہونٹ تھے۔ صوفیہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد صوفیہ اور اس کی پانچ بہنوں کی اس کی والدہ نے اکیلے پرورش کی اور مجبوری کے تحت صوفیہ کی شادی مصعب سے کر دی۔

صوفیہ کے گھر میں آنے کے بعد حالات بدلتے چلے گئے کہتے ہیں نا عورت ذات کی سب سے بڑی دشمن ایک عورت ہی ہوتی ہے۔ انیسہ کا دل آئینے کی طرح صاف تھا مگر صوفیہ انیسہ کو ایک منٹ کے لیے برداشت

ایک روز مصعب دفتر کے کام سے شہر سے باہر گیا اور صوفیہ نے انیسہ کو اپنے سامان کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا یہ کہہ کر کہ اب مصعب کو اس کی ضرورت نہیں ۔انیسہ روتی رہی ، گڑگڑاتی رہی منت کرتی رہی مگر ہار مان کر اسے وہاں سے جانا پڑا ۔ مصعب کے پوچھنے پر صوفیہ نے یہ کہہ دیا کہ وہ نہیں جانتی وہ کیوں چلی گئی اور کہاں چلی گئی۔

انیسہ کے جانے کے بعد مصعب نے اسے بہت ڈھونڈا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ بہت گم رہنے لگا۔ صوفیہ سے اور اپنی بیٹیوں سے الگ الگ رہنے لگا۔ رات رات بھر گھر نہیں آتا عجیب طرح کے خیالوں میں گم رہتا۔

نہ کرتی ہر وقت بے اولادی کا طعنہ دیتی۔ غیر ہونے کا طعنہ دیتی مگر صرف مصعب کی خوشی کی خاطر انیسہ سب کچھ سہہ لیتی اور اپنی تکلیف کو آنسوؤں کے ذریعے اپنے دل ودماغ سے نکال دیتی۔

کئی سال گزر گئے ۔وقت پر لگا کر اڑتا گیا، ان سالوں میں مصعب اور صوفیہ کی دو بیٹیاں بڑی ہوگئیں۔مصعب کے بالوں سے سفیدی جھلکنے لگی۔صوفیہ اتنے سالوں بعد بھی انیسہ کو برداشت نہیں کرتی تھی۔

ایک روز مصعب دفتر کے کام سے شہر سے باہر گیا اور صوفیہ نے انیسہ کو اپنے سامان کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا یہ کہہ کر کہ اب مصعب کو اس کی ضرورت نہیں۔انیسہ روتی رہی، گڑگڑاتی رہی منت کرتی رہی مگر ہار مان کر اسے وہاں سے جانا پڑا۔مصعب کے پوچھنے پر صوفیہ نے یہ کہہ دیا کہ وہ نہیں جانتی وہ کیوں چلی گئی اور کہاں چلی گئی۔

انیسہ کے جانے کے بعد مصعب نے اسے بہت ڈھونڈا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔وہ بہت گم رہنے لگا۔صوفیہ سے اور اپنی بیٹیوں سے الگ الگ رہنے لگا۔رات رات بھر گھر نہیں آتا عجیب طرح کے خیالوں میں گم رہتا۔

ایک روز مصعب کے گھر پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو سامنے سائرہ کھڑی تھی۔مصعب نے اندر آنے کو کہا مگر سائرہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔"میں آپ کو صرف یہ اطلاع دینے آئی تھی کہ انیسہ ......انیسہ کا سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا ہے اور میرے شوہر ابھی تدفین کر کے آ رہے ہیں' یہ سنتے ہی مصعب کے پاؤں سے زمین ہی نکل گئی۔ یہ کہہ کر سائرہ وہاں سے رخصت ہوگئی۔مصعب نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا اور کنارے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا ان تمام اچھے لمحات اور یادوں کے بارے میں جو انیسہ سے منسلک تھیں۔اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے ہلکے ہلکے قطرے گر کر اس کی ہتھیلیوں کو نم کر رہے تھے وہ سوچنے لگا کہ انیسہ نے مجھے ہر خوشی دی، میرے لیے اپنا خاندان، اپنا سماج، اپنا مذہب چھوڑ کر وہ صرف میرے ساتھ زندگی گزارنے کو تیار ہوگئی اور میں...... میں اولاد کی خوشی کے لیے اندھا ہوگیا تھا اور اسے یوں ہی بے سہاروں کی طرح چھوڑ دیا۔میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں جو میں نے اس کے ساتھ کیا اس کے لیے میں شرمندہ ہوں اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہ کر معافی مانگنا چاہتا تھا مگر......مگر وہ مجھے ہی اکیلا چھوڑ کے چلی گئی۔کاش کاش میں اولاد کی ضد نہ کرتا۔اولاد کی خواہش نہ کرتا تو میری زندگی انیسہ اور اولاد کے درمیان بٹ کر نہ رہتی۔ اے خدا یہ میں نے کیا کیا؟"

ان ہی خیالوں میں کھویا مصعب ساری رات روتا رہا۔اس کی آنکھوں میں پشیمانی کے آنسو تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا اسے اپنے وجود سے کوفت ہو رہی تھی۔انیسہ کی پیاری صورت بار بار اس کے گرد گردش کر رہی تھی۔

صبح ہوئی حسب معمول سورج نکلا مگر روزانہ کی طرح مصعب نہ اٹھا اس کی سانسیں اب انیسہ کے نام ہو چکی تھیں وہ انیسہ کے بغیر زندگی کا تصور ختم کر چکا تھا اور صوفیہ کو جوان بیٹیوں کے ساتھ دوراہے پر چھوڑ کر کہیں دور جا چکا تھا ایسا دوراہا جس میں سے کسی ایک کو چننا بہت مشکل تھا۔

□□□

Unzela Ansari

65, Mahada Colony

Near Arqam Masjid

Malegaon(Nasik)-423203 (MS)

شہناز فاطمہ صدیقی

غزلیں

غم کی تفسیر میرے ہاتھ میں ہے
اس کی تحریر میرے ہاتھ میں ہے

اپنی قسمت سے کیوں نہ لڑ جاؤں
میری تدبیر میرے ہاتھ میں ہے

خواب ایسے سنا رہے ہیں آپ
جیسے تعبیر میرے ہاتھ میں ہے

ٹوٹتی ہے نہ زنگ کھاتی ہے
کیسی زنجیر میرے ہاتھ میں ہے

اب نظاروں میں کچھ نہیں رکھا
تیری تصویر میرے ہاتھ میں ہے

میری تقدیر میں نہیں ہے تو
تیری تقدیر میرے ہاتھ میں ہے

غم کی تفسیر تو ہونے سے رہا
اب کوئی میر تو ہونے سے رہا

میں قلم ہوں مرے مقتول الگ
اب میں شمشیر تو ہونے سے رہا

خود بھی آجائے مقابل تو اگر
اپنی تصویر تو ہونے سے رہا

وہ کسی کا بھی ہو پھر کیا کرنا
میری تقدیر تو ہونے سے رہا

لاکھ پیارا ہے ترا شہر مگر
اب یہ کشمیر تو ہونے سے رہا

Shahnaz Fatima Siddiqui
H. No. 293/57-D
Old Haider Ganj, Lakarmandi
Lucknow-226003(UP)

ایمن تنزیل

میری کہانی کی عورت

میری کہانی کی عورت
تمھارے طنز کے اولوں سے
گیہوں کی بالیوں کی طرح
زمیں دوز نہیں ہوتی!
میری کہانی کی عورت
سوغات میں ملی
رواجوں کی زنجیروں کو
اپنا ساز سنگھار نہیں بناتی!
میری کہانی کی عورت
بجھتی روشنی کی
تھرتھراہٹ پر اداس نہ ہو کر
اجالے کو اپنی دسترس
میں کر لیتی ہے!
میری کہانی کی عورت
خوابوں کے ذائقے
نہیں چکھتی
اور نہ کبوتر کی طرح
خوف سے موندتی ہے آنکھیں!

میری کہانی کی عورت
نہ اتنی ناداں ہے کہ
بہار و خزاں کے منظر کا
فرق نہ جانے!
کیونکہ،
میری کہانی کی عورت جانتی ہے
اس کا وجود کئی آتی جاتی
نسلوں کا امین ہے!
میری کہانی کی عورت جانتی ہے
عورت صرف عنوان نہیں
کائناتی صداقت کی پہچان ہے!!

Aiman Tanzeel
Ghair Peepal Wala,
Gali Akhlaq Khan
Rampur- 244901 (U.P)

لذیذ پکوان

مینگو اسکوائش

اجزا: مینگو اور کیری ایک کلو، چینی ایک کلو، ٹاٹری 4 / 1 چائے کا چمچہ

ترکیب: مینگو یا کیری کا چھلکا اتار کر کٹ کریں اور اُبال لیں۔ ایک لیٹر پانی کے ساتھ پھر بلینڈ کر کے رکھ دیں۔ اب ایک لیٹر پانی میں چینی کو پکائیں۔ ٹاٹری ڈال کر مکس کر کے چھان لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر بوتل میں بھر لیں۔ یاد رہے بوتل واش کے بعد ڈرائی کر کے 5 منٹ اوون میں ضرور رکھیں تاکہ اسکوائش خراب نہ ہو۔ اب گلاس میں 4 کھانے کے چمچے اسکوائش ڈالیں۔ پانی ڈال کر مکس کر لیں۔

شربت

اجزا: دودھ 2 کپ، تخم ملنگا 2 کھانے کے چمچے، لال شربت 4 کھانے کے چمچے

ترکیب: ایک جگ میں 2 کپ ٹھنڈا دودھ، 4 کھانے کے چمچے

لال شربت اور 2 کھانے کے چمچے بھیگا ہوا تخم ملنگا ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر اسے گلاسوں میں نکالیں اور تھوڑی سی مزید برف ڈال کر سرو کریں۔

جیلو پائن ایپل شیک

اجزا: دودھ 1 کپ، کریم 1/2 کپ، کاسٹر شوگر 1 کھانے کا

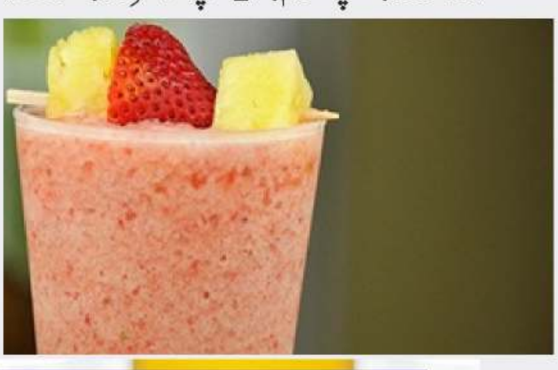

چمچ، پائن ایپل چنکس 1 کپ، اسٹرابیری جیلی 1 کپ، برف حسب ضرورت

ترکیب: بلینڈر میں تمام اجزا ڈال کر بلینڈ کرلیں۔ جب مشروب اچھی طرح مکس ہوجائے تو اس میں جیلی کے کیوبز شامل کردیں۔ اب گلاس میں نکال لیں اور ٹھنڈا سرو کریں۔

کیری کا شربت

اجزا: کیری ایک کلو، چینی ایک کلو، پانی چار گلاس

ترکیب:

1۔ کیری کو اچھی طرح سے دھولیں اور اس کے اوپر کا حصہ صاف کرلیں۔

2۔ اس میں چار گلاس پانی ڈال کر اچھی طرح ابال لیں۔ جب کیری میں ابال آجائے اور اچھی طرح گل جائے تو چولھا بند کرلیں۔

3۔ ٹھنڈا ہونے پر صاف ہاتھوں کی مدد سے اس کا گودا نکال لیں۔

4۔ سارا گودا اور اس کا بچا ہوا پانی کم ہوجائے تو پانی اور مکس کرلیں اور اس کو ایک کلو چینی کے ساتھ گرائنڈر میں ڈال کر گرائنڈ کرلیں۔

5۔ اس کے بعد اس مکسچر کو ایک پتیلی میں ڈال کر پکالیں مکسچر اتنا ہو کہ پکنے کے بعد ایک لیٹر کی بوتل میں آجائے۔ لکڑی کا چمچہ مسلسل چلاتے رہیں۔ جب اس کا رنگ تھوڑا تبدیل ہونا شروع ہوجائے، چینی پک جائے اور یہ گاڑھا ہوجائے تو چولہا بند کردیں۔

6۔ ٹھنڈا ہوجائے تو ایک بوتل میں بھر کر فریج میں رکھ لیں۔ کیری کا شربت تیار ہے۔

جب استعمال کرنا ہو تو ایک گلاس ٹھنڈے پانی میں 2 کھانے کے چمچے اس مکسچر کو ڈالیں اور برف ڈال کر ٹھنڈا ٹھنڈا استعمال کریں۔

فزی پنچ باؤل

اجزا: فالسہ جوس یا کاسٹر شوگر، اورنج جوس دو کپ، پائن ایپل

جوس دو کپ، لیموں کا رس آدھا کپ، شہد دو کھانے کے چمچ، برف چار کیوبز، فروٹی آئس کیوبز دو سے آدھا کیوبز، سوڈا واٹر، وائٹ تین بوتل

فزی کے لیے: پائن ایپل + پودینہ ایک کپ، اسٹرابری آدھا کپ، خربوزہ ایک کپ، واٹرمیلن، ٹینگ کیوبز ایک کپ

ترکیب: فالسہ جوس، اورنج جوس، پائن ایپل جوس، لیموں کا رس، شہد اور برف کو اچھی طرح مکس کرلیں۔ سوڈا اور واٹر ڈال کر پیش کریں۔ فزی پنچ باؤل کا لطف سوڈا واٹر کے ساتھ دوبالا ہوجائے گا۔

کافی کوکی شیک

اجزا: کافی آئس کریم تین اسکوپ، ٹھنڈا دودھ آدھا کپ، کٹی برف ایک کپ، کرمبلڈ چاکلیٹ کوکی دو کپ

ترکیب: ایک بلینڈر میں تین اسکوپ کافی آئس کریم، آدھا کپ ٹھنڈا دودھ، ایک کپ کٹی برف، اور دو کپ کرمبلڈ چاکلیٹ کوکی کو اچھی طرح بلینڈ کرلیں۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی

آدھی آبادی کے صحتی مسائل

بہت سے امراض ہیں جنھیں کثرت وقوع (Common Happening) کی وجہ سے اب نارمل (طبعی) سمجھا جانے لگا ہے بطور خاص خواتین میں کچھ کیفیات (Conditions) ایسی ہیں جن کی طرف صرف اس لیے توجہ نہیں دی جاتی کہ یہ کوئی بیماری نہیں ہے ایسا تو سبھی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اپنے اس مضمون میں ایسی بیماریوں یا مرضی کیفیات کے بارے میں لکھ رہا ہوں جن کی طرف بروقت توجہ نہ دینا خطرناک صورتحال کا سبب بن سکتا ہے۔

1۔ لیکوریا

اسے طب یونانی میں سیلان رحم کہتے ہیں اس مرض میں پیشاب کے راستے سفید پانی جیسی رطوبت آتی رہتی ہے۔ یہ مرض اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اکثر خواتین سے یہ سننے کو ملتا ہے کہ بس نارمل رطوبت آتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ ورم رحم (بچہ دانی کے ورم) کی اہم علامت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ رحم (Uterus) کے عضلات (Muscles) میں ورم ہونے کی وجہ سے رطوبت نکلنا شروع ہو جاتی ہے جیسے جیسے مرض بڑھتا ہے مریض کی بھوک کم ہو جاتی ہے، وزن کم ہو جاتا ہے کمر میں درد ہونے لگتا ہے، چکر آتے ہیں، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ جاتے ہیں بعض مریضوں میں یہ صورتحال بچہ دانی کے کینسر کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس پر توجہ دینے سے پہلے اس کے اسباب سمجھنے کی ضرورت ہے تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اس مرض کا بنیادی سبب بیت الخلاء (Toilets) کا غیر صحتی (Unhygienic) ماحول (Atmosphere) ہے جو بہت سے متعدی (Infectious) امراض کا سبب بن جاتا ہے۔

آج کا سب سے بڑا سماجی سانحہ (Social Tragedy) یہ ہے کہ ہم ڈرائنگ روم کی سجاوٹ پر تو بڑا دھیان دیتے ہیں لیکن ٹوائلٹس، حمام (Bathroom) اور باورچی خانہ (Kitchen) کی گندگیوں پر بالکل توجہ نہیں کرتے اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام جگہوں میں ایسے جراثیم پیدا ہوتے ہیں جو نہایت خطرناک امراض کا سبب بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیواروں پر لگی پھپھوند (Fungus) کھانے کی نلی کے کینسر کا اہم سبب ہے اسی طرح ڈبل روٹی پر لگے فنگس سے لیور کینسر کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرف توجہ دی جائے اور فرش وغیرہ کی صفائی کا مکمل انتظام کیا جائے۔ آج کل لوبان کی دھونی کا رواج ختم ہو گیا ہے، مختلف رنگوں کے اسپرے استعمال کیے جاتے ہیں جن کے اپنے مضر اثرات بھی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے گھروں میں لوبان کی دھونی دی جاتی تھی، مچھروں، کیڑوں مکوڑوں، چھپکلیوں، کاکروچ جیسی

چیزوں کے لیے لوبان سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے اچھا ہوگا اگر یہ دھونی نیم کے پتوں کے ساتھ دی جائے اس سے ماحول کی تمام کثافت (Pollution) آسانی سے ختم کی جاسکتی ہے۔

2۔خون کی کمی (Anaemia)

خون کی کمی خواتین میں ایک اہم مرض ہے عام طور سے خون میں ہیموگلوبن کی مقدار 13 سے 14 gm % ہونی چاہیے لیکن یہ مقدار 11 اور 12 gm % سے زیادہ نہیں ہوتی ۔خون کی کمی کی وجہ سے عام جسمانی صحت کے علاوہ بچہ کی نگہداشت ، دوران حمل بچہ کی پرورش پر بھی غلط اثر پڑتا ہے۔ہوتا یہ ہے کہ خواتین بھوک کی کمی اور چکر کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے مطب کے چکر لگاتی ہیں۔کبھی کبھی تو سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی کرا کے چکر کے سبب کا پتہ لگانے کی کوشش کرتی ہیں حالانکہ اس طرح کی تمام تکلیفیں خون کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔عورتوں میں خون کی کمی کے دو اہم اسباب ہوتے ہیں۔ایک تو ماہواری کی پریشانیاں جو عام طور سے بچہ میں فاصلہ رکھنے کی تدابیر کے استعمال سے ہوجاتی ہیں، زیادہ تر خواتین میں ہر مہینہ خون زیادہ نکل جاتا ہے نتیجہ میں ہیموگلوبن (Haemoglobin) کی مقدار کم ہوجاتی ہے اور مریض بھوک کی کمی، چکر اور پنڈلیوں کے درد کی مستقل شکایت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

خون کی کمی کا دوسرا سبب ہماری غذاؤں میں نقلی کھانے کے تیل، فاسٹ فوڈ اور ہائی برڈ طور سے اگائی گئی سبزیوں اور پھلوں اور نقلی دودھ کا استعمال ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے سماج میں تمام چیزوں کا بجٹ تو ہوتا ہے ۔شادی، عقیقہ، کا بجٹ الگ ، میک اپ کا الگ، کپڑوں اور زیورات کا الگ ،لیکن اگر بجٹ نہیں ہوتا تو ہیلتھ یا صحت کے لیے کوئی بجٹ نہیں ہوتا۔اگر ہم تھوڑا سا بیدار بھی ہوجائیں تو ٹی وی اشتہارات میں بتائی گئی مقوی مصنوعات (Products) کو گھر لے آتے ہیں بس اس کے علاوہ کوئی اور توجہ نہیں ہوتی۔ضرورت ہے کہ گھروں میں اگر زمین میں ممکن نہ ہو تو لوہے کے اسٹینڈ بنا کر گملوں میں دھنیا، میتھی ، لوکی ، پودینہ جیسی چیزیں دیسی کھاد سے پیدا کریں ایسا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔یاد رہے کہ دھنیا، میتھی اور پودینہ ایسی نعمتیں ہیں کہ ان کے استعمال سے بہت سی روزمرہ کی بیماریوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔کھانے میں سرکہ، پیاز اور لیموں کا استعمال عام کریں پھلوں میں گاجر، پپیتہ، سنگترہ، موسمی اور مولی کو کھانے کا حصہ بنائیں اس طرح بہت سی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔خون کی کمی کے لیے چقندر، کرم کلہ، پالک کی سبزی اور انگور وانناس کا استعمال بے حد مفید ہوتا ہے اس کے علاوہ اخروٹ، کاجو، بادام کھجور جیسے خشک میوہ جات کا استعمال بھی خون کی کمی اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے امراض کے لیے بہت کارگر ہے۔

3۔بچوں کو دودھ پلانے سے عدم دلچسپی

آج کل پھر سے ماں کے دودھ (Mother feeding) کی اہمیت پر اطباء زور دینے لگے ہیں۔مجھے یاد ہے کہ کوئی ۲۵ سال پہلے ماں کے دودھ کو سختی سے منع کیا جاتا تھا حالانکہ اگر کوئی چیز بچہ کے لیے تعدیہ (Infection) سے محفوظ ہے تو صرف ماں کا دودھ ہے۔ماں کا دودھ نہ پلانا تو اب اسٹیٹس سمبل (Status Symbol) بن گیا ہے۔کوئی دودھ پلانا نہیں چاہتا، بس دودھ کے ڈبے آتے ہیں بچہ اس مصنوعی دودھ میں کیا پیتا ہے اسے تو اللہ ہی جانتا ہے۔البتہ ماں دودھ نہ پلا کر مختلف امراض میں ضرور مبتلا ہوجاتی ہے۔بچے کو دودھ پلانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جسم کے اندر ہارمون کا تناسب (Ratio) بنا رہتا ہے۔آج کل اکثر عورتوں میں تھائرائڈ بڑھنے کی وجہ دودھ نہ پلانے کی وجہ سے ہارمون کی بے اعتدالی (Abnormality) ہوتی ہے۔میرا تجربہ ہے کہ اگر اس طرف توجہ دی جائے تو بہت سے امراض یہاں تک کہ بریسٹ کینسر جیسے امراض سے نجات مل سکتی ہے۔

□□□

Dr. Syed Mohd. Hassan Nigrami
Dr. Hassan Herbal Clinic
476/6c Behind Madeh Ganj
Police Chowki
Sitapur Road, Lucknow 226020

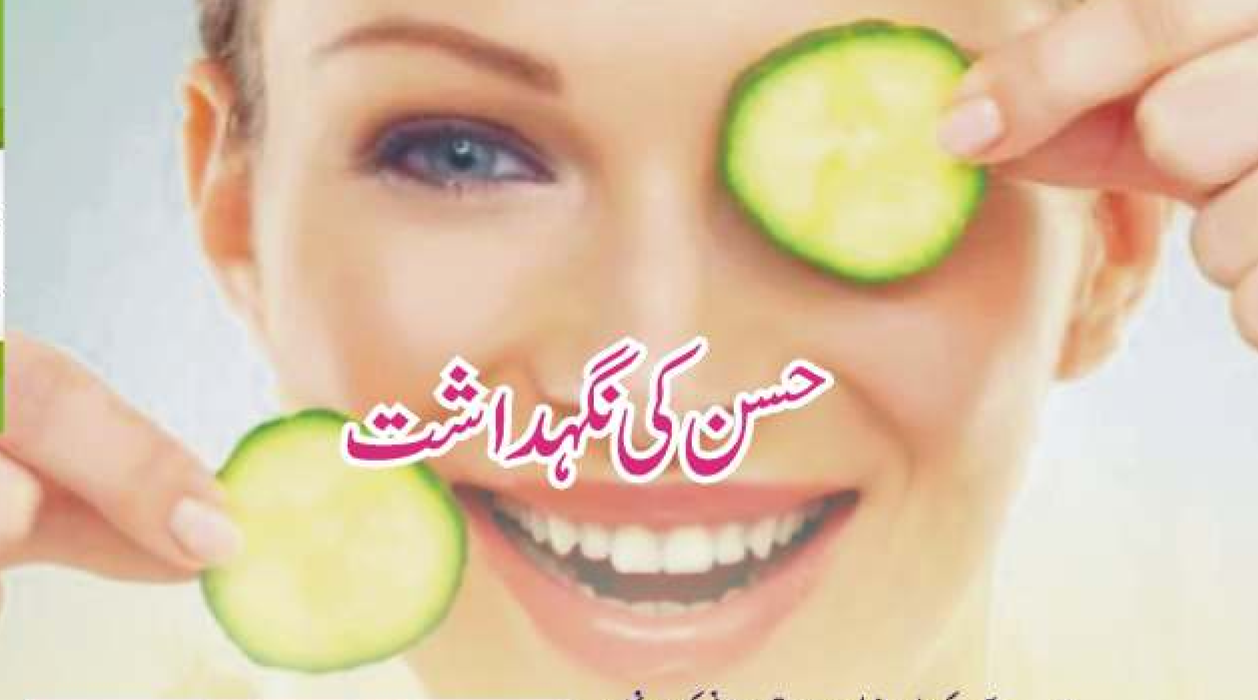

حسن کی نگہداشت

دھوپ سے آپ کی جلد سانولی ہوجائے تو پریشانی کی بات نہیں ابھی یہ نسخہ اپنائیں اور سانولی جلد سے جان چھڑائیں

آج کل گرمی بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے دھوپ میں آنا جانا آپ کی جلد کو بھی خراب کرتا ہے۔

بعض وقت دھوپ میں اسکول، کالج، دفتر یا کہیں اور جانے سے آپ کی جلد کا رنگ سانولا ہوجاتا ہے۔ اس کے لیے ایلوویرا کا پتہ توڑ کر اس کا گودا لگائیں۔

کیلے کے چھلکوں سے دانتوں کو چمکائیں اور جتنا دل کرے اتنا مسکرائیں

کیلے کے چھلکے کو روزانہ دانتوں پر رگڑنے سے ان میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں موجود پوٹاشیم، میگنیشیم اور مینگنیز دانتوں پر جے پیلے پن کو دور کرنے میں مدد کرتا ہے۔

باقاعدگی کے ساتھ یہ عمل کیا جائے تو کچھ دنوں میں دانتوں میں قدرتی چمک آجاتی ہے۔

دن میں دوبار کیلے کے چھلکے دانتوں پر رگڑنے سے فائدہ ہوتا ہے۔

ٹماٹر چہرے کے لیے بہترین ماسک

1 عدد ٹماٹر کو بلینڈ کر کے چھان لیں۔ چھانے ہوئے رس میں برابر مقدار میں دودھ ملا لیں۔ اب اسے چہرے اور گردن پر لگائیں۔ 10 منٹ بعد حسب ضرورت پانی سے چہرہ اچھی طرح دھولیں۔ یہ آئلی اسکن سے نجات کا بہترین طریقہ ہے۔

تبت کریم میں یہ چیز ملا کر چہرے پر لگائیں اور پندرہ دن میں بہترین نتائج پائیں

ایک کپ میں لیموں کا رس اور عرق گلاب شامل کریں۔ پھر تبت کریم کی بوتل سے ساری کریم نکال کر اس میں شامل کرلیں۔ اب اچھی طرح مکس کریں۔ رات کو سونے سے پہلے کسی اچھے صابن سے چہرہ دھوئیں اور سکھالیں۔

پھر حسب ضرورت کریم سے چہرے کا مساج کریں۔ صبح اٹھ کر نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔ دس سے پندرہ دن میں آپ کی رنگت میں وہ نکھار آئے گا کہ آپ یقین نہیں کریں گی۔

دودھ سے بنائیں گرمی میں چہرے کو فریش نرم وملائم اور چمکدار صرف چند دنوں میں

تازہ دودھ روئی کی مدد سے اپنے چہرے پر لگائیں۔ پھر آدھے گھنٹے بعد ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ یہ عمل روزانہ کریں۔ اس سے آپ کی جلد چمکدار اور نرم ہوجائے گی۔

بالوں سے جوؤں کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو بس یہ ٹوٹکہ شروع کردیں اور چند دنوں میں جوؤں کے خاتمے کو ممکن بنائیں

پسے لہسن کو لیموں کے رس، پانی اور سرکہ کے ساتھ مکس کریں۔ اسے سر کی جلد پر چار پانچ گھنٹوں یا ساری رات لگا رہنے دیں۔ اگلے دن شیمپو کرلیں۔ بیس دن تک سر کی جلد پر رات کے وقت المونیم ہائیڈر پر آکسائیڈ لگائیں۔

مینی کیور اور پیڈی کیور بتائے گئے طریقے سے گھر میں کریں اور بنائیں اپنے ہاتھوں پیروں کو خوبصورت بغیر پارلر گئے

سب سے پہلے نیل کٹر سے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن تراش لیں۔ ایک ٹب میں نیم گرم پانی لے کر اس میں تھوڑا سا شیمپو اور نمک شامل کردیں۔ ٹوتھ برش کی مدد سے پانی میں ڈوبے ہوئے ہاتھوں پیروں کے ناخن اچھی طرح صاف کرلیں۔ اب ہاتھوں اور پیروں کو اس برش کی مدد سے ہلکے ہاتھوں سے صاف کرلیں۔

پھر ہاتھوں پیروں کو پانی سے دھو کر تولیے سے خشک کرلیں۔ اب جو اسکرب آپ استعمال کرتے ہیں وہ ہاتھوں اور پیروں میں ملیں۔ اسکرب نہ ہونے کی صورت میں ایک پیالی دہی میں 2 چمچ ہلدی ملا کر ہاتھوں اور پیروں میں ملیں۔ پانچ سے دس منٹ ملنے کے بعد ہاتھوں اور پیروں کو دھولیں۔ آخر میں عرق گلاب لگالیں۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' اپریل 2019 نظر نواز ہوا۔ خواتین کے بارے میں آپ کے احساسات قابل قدر ہیں۔ بہبودیٔ نسواں کے ساتھ ساتھ جہاں تک اردو کی ترویج کا تعلق ہے تو قومی اردو کونسل اپنے واضح ترین پروگراموں کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں اردو کو گھر گھر پہنچانے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس بیان میں توصیف کی نیت نہیں، بلکہ یہ حقائق طشت از بام ہیں۔ خیر! یہ شمارہ قابل قدر گیارہ عنوانات سے مزیّن ہے۔ اداریہ سے متعلق اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ البتہ شخصیت کے ذیل میں کور اسٹوری (ص5) میں میرابائی کے کلام کا سماجی، تہذیبی اور مذہبی عقیدت کا بکھان کیا گیا ہے۔ حسین نگارش ہے۔۔نکہت سخن کے ذیل میں پروین شیر کے اشعار قابل داد ہیں۔ جہانِ نسواں کے تحت سات عمدہ مقالے درج ہیں جن میں اکیسویں صدی کے خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات (ص15) نہایت مناسب ہے۔

ص 34 تا ص 49 میں چار کہانیاں دی گئی ہیں۔ ان میں 'ہیرا کس کا' (ص 34) اچھی کہانی ہے۔ حسن سخن میں شامل ادا جعفری کی غزلیں (ص50) قابل تعریف و قابل داد ہیں۔ باورچی خانہ میں لذیذ پکوان (ص 52) میں ملذذ غذاؤں کی تیاری کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ کھانے تیار کرکے ذائقہ چکھیئے۔ صحت کے تحت (ص54) سورج کی کرنوں کی افادیت کو روشن کیا گیا ہے۔ حسن کی نگہداشت اور آرائش و زیبائش کے لیے اوّل تو آپ کو شہد، دودھ، انڈے، کھیرے، آلو وغیرہ سے اپنے چہرے کا میک اپ کرنا ہوگا تب جاکے نقوش پر نکھار آئے گا۔ آزمائش شرط ہے۔ تاثرات (ص59) میں نیک خواہشات کا اظہار اور خواتین خبرنامہ میں دو اہم خبریں دی گئی ہیں۔ پڑھتے پڑھتے رسالہ کب ختم ہوگیا، کچھ پتہ ہی نہ چلا اور زبان پر بلاقصد فیض کا یہ شعر جاری ہوگیا۔

ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گلبدن گویا
کہیں قریب سے گیسو بدوش غنچہ بدست

مصطفٰی ندیم خاں غوری، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'خواتین دنیا' شمارہ اپریل 2019 موصول ہوا۔

خواتین دنیا واقعی خواتین کی نمائندگی کرنے والا ایک معیاری ماہنامہ ہے جس میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر مضامین اور افسانوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں عورتوں کے مسائل کا بیان بھی ہے اور ان کی ادبی اور لسانی خدمات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ میرابائی پر شاہد ماہلی اور خواتین کی پسماندگی پر امان اللہ صاحب کا مضمون انتہائی اہم اور کارآمد ہے۔ دیگر مشمولات میں باورچی

خانہ بھی ہے اور صحت اور آرائش وزیبائش بھی۔ گویا عورتوں کا ایک جہاں آباد ہے۔ دعا ہے کہ روز افزوں اس جہان کے حسن وجمال میں اضافہ ہوتا رہے آمین!۔

سلمہ حجاب، لکھنؤ (یوپی)

ماہنامہ خواتین دنیا مئی2019 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر شفقت آمنہ کی تصویر دیکھ کر آج کی عورت پر بے اختیار فخر کرنے کو دل چاہا۔ خواتین دنیا کے تمام مشمولات دلچسپ اور معلومات افزا ہیں جس کے لیے میں قومی کونسل کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

پروفیسر صالحہ رشید، صدر شعبہ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی

ماہنامہ ''خواتین دنیا'' اپریل 2019 کا شمارہ نظر سے گذرا۔ اس خوبصورت میگزین میں اپنا پہلا مضمون ''حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں بچوں کے مسائل کی عکاسی'' دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ماقبل کی طرح اس مہینے کا اداریہ بھی بہت کارآمد اور معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ مدیر اعلیٰ صاحب نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ ''خواتین دنیا آپ کا اپنا رسالہ ہے'' یقیناً اسے پڑھ کر نئے لکھنے والوں کو حوصلہ ملے گا۔ میں ذاتی طور پر افسانے اور کہانیوں کی شروع سے شیدائی رہی ہوں، لہٰذا مذکورہ شمارے کے تمام مشمولات میں کہانیوں نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ ان میں ص: 41 پر شامل 'شاہدہ شاہین' کی کہانی ''اگنی پریکشا'' مجھے بے حد پسند آئی، یہ کہانی عورت کی زندگی کا المیہ ہے جو ہمیشہ سے ہی اپنی پاک دامنی کا ثبوت دیتی آرہی ہے، لیکن اسے اکثر شک کے دائرے میں رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'خواتین دنیا' ایک ایسا رسالہ ہے جس میں خواتین کے لیے سب کچھ ہے، ادبی مضامین، کہانیاں، شاعری، خواتین کی خبریں، لذیذ پکوان کے ساتھ ساتھ ان کے حسن اور صحت کی نگہداشت بھی کی جاتی ہے۔ اس رسالے کی ایک اہم خوبی اس کی آرائش وزیبائش بھی ہے، مضامین سے جڑے مصنفین کی تصویریں، ان کی تصانیف کی تصویریں خوبصورتی سے پیش کی جاتی ہیں۔ میری نیک خواہشات ماہنامہ 'خواتین دنیا' سے وابستہ ہیں۔

ثنا غزل، بجرڈیہہ، وارانسی، اترپردیش

ماہنامہ ''خواتین دنیا'' اپریل 2019 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ شمارے کے کور پیج پر 'میرا بائی' کی دلکش تصویر نظر آئی۔ تصویر دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ شاید یہ شمارہ 'میرا بائی' کے نام وقف ہو، لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ بھی عام شمارہ رہا جس میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے گئے ہیں زیادہ تر مضامین خواتین کے ہیں اور یہ ضروری بھی ہے کیونکہ رسالہ ہی خواتین کا ہے۔ شاہد ماہلی کا مضمون ''میرا بائی کی شاعری کا سماجی اور تہذیبی مطالعہ'' بہت ہی عمدہ ہے۔ کرشن بھگتی اور مذہبی شاعری کے لیے مشہور میرا بائی کی شاعری میں مضمون نگار نے سماجی اور تہذیبی عناصر کو پیش کرکے مضمون کو ایک نیا روپ عطا کیا ہے۔ 'معصوم زہرا' کا مضمون ''ہندوستانی معاشرے میں خواتین کی صورت حال'' اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب خواتین اپنے مسائل اور صورت حال پر گہرائی سے سوچ رہی ہیں۔ حالانکہ قابل مضمون نگار خواتین کی پس ماندگی کی اہم وجہ تعلیم کی کمی کو قرار دیتی ہیں جو کہ حقیقت پر مبنی ہے۔ دیگر مضامین بھی قابل ستائش ہیں۔ رسالے کے صفحہ نمبر 29 پر 'ثنا غزل' کا مضمون ''حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں بچوں کے مسائل کی عکاسی'' پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ انھوں نے حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کرکے بچوں کے مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ مضمون میں ''بڈھا سود خوار، ڈھائی سیر آٹا، بھیک، موزوں کا کارخانہ اور 'ماں بیٹا' جیسے افسانوں کے کم سن کردار اور ان کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جو کہ یقیناً معلوماتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ رسالہ اسی طرح نئے اور اچھے لکھنے والوں کو مواقع فراہم کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہے گا۔ ساتھ ہی یہ دعا کرتا ہوں کہ ماہنامہ ''خواتین دنیا'' اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ دمکتا رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہو۔

ظفر الاسلام، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ماہنامہ خواتین دنیا جون2019 کا شمارہ نظر سے گزرا۔ اس شمارے کے مشمولات بھی کافی دلچسپ ہیں۔ قمر جمالی کا انٹرویو جو ڈاکٹر نشاں زیدی کے ذریعے لیا گیا ہے کافی اہم اور معلوماتی ہے۔ شخصیت کے عنوان سے محمد دانش غنی کا مضمون 'ش بانو ادیب کی افسانہ نگاری' بھی توجہ کے لائق ہے۔ جہان نسواں کے تحت جو مضامین درج ہیں ان میں 'ریڈیو ڈرامہ' رضیہ سجاد ظہیر کے ناول 'اللہ میگھ دے' کی تہذیبی وعصری معنویت، اردو افسانے کا تانیثی تناظر، جدید اردو افسانہ اور خواتین افسانہ نگار، اہمیت کے حامل ہیں۔ اس رسالے میں خواتین سے متعلق معلوماتی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ خواتین سے متعلق آرائش وزیبائش، باورچی خانہ، خواتین خبر نامہ بھی کافی توجہ طلب ہے۔ اس رسالے میں خواتین کے لیے بہت سا مواد موجود ہے جو خواتین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

شبنم، نئی دہلی

□□□

خواتین خبرنامہ

اے ایم یو کی تعلیم یافتہ انعم بنیں دہلی میں پہلی باحجاب خاتون جج

علی گڑھ۔26 مئی 2019 (آئی این این)۔ وکیل نہیں جج بن کر معاشرے میں عدم مساوات اور نا انصافی کو ختم کرنے کا خواب سجانے والی اے ایم یو کی سابق طالبہ انعم رئیس خان کا خواب پورا ہو گیا ہے۔ وہ دہلی میں پہلی باحجاب جج بنی ہیں۔ انھوں نے دہلی جوڈیشیل سروس امتحان

2018 میں 71ویں رینک حاصل کی ہے۔ انعم رئیس خان نے اے ایم یو سے بارہویں کے بعد 2015 میں بی اے ایل ایل بی کیا۔ کانسٹیٹیوشنل لاء میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 2016 میں نیشنل لاء یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کیا۔ انھوں نے یو جی سی نیٹ بھی کوالیفائی کیا ہے۔ سماجی شعبے میں کام کرتے ہوئے قانونی خواندگی اور ماحول کے لیے لوگوں کو بیدار کیا۔ تعلیم کے دوران وہ اے ایم یو ایکو کلب کی رکن اور لاء سوسائٹی کی سکریٹری رہیں۔ 2017 میں دہلی بار کونسل میں نامزدگی کرائی۔ شادی ہونے کے بعد شوہر سے دہلی جوڈیشیل سروس کا امتحان دینے کی ضد کی، ان کے شوہر آسٹریلیا میں سافٹ ویئر انجینئر ہیں۔ انھوں نے 26 سال کی عمر میں یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے والد اے آر خان ریلوے میں اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ان کی ماں ثمینہ خان اے ایم یو میں انگریزی سیکشن میں پروفیسر ہیں۔ ان کی ایک بہن الوینا خان نے پلس ٹو کیا ہے۔ انعم نے بتایا کہ ان کی ہمیشہ یہی خواہش تھی کہ بڑی ہو کر جج بنوں۔ جج ایک ایسی طاقت ہے جو سماج میں عدم مساوات اور نا انصافی کو ختم کر سکتی ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ انصاف کر کے ملک کی خدمت کریں گی۔ لاء کے طلبہ کو ان کا پیغام ہے کہ وہ معاشرے میں عدم مساوات اور نا انصافی کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کریں۔

سورت کی طالبہ کھنڈ والا نے JIPMER، AIIMS، JEE، NEET یکساں کامیاب کیے، ایم آئی ٹی میں دماغی امراض پر ریسرچ کا عزم

سورت 23 جون، سیاست، حیدر آباد (سیاست ڈاٹ کام) گجرات کے شہر سورت کی طالبہ استوتی کھنڈ والا نے تمام چاروں مسابقتی امتحانات JIPMER,NEET,JEE، AIIMS کو کوالیفائی کیا ہے۔ انھوں نے Massachusetts انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی سے اسکالرشپ حاصل کرنے کے علاوہ دماغی امراض پر ریسرچ کرنے کے مضمون کو منتخب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ امریکہ کے اس اہم ادارے میں وہ دماغی امراض پر ریسرچ کریں گی۔ انھوں نے کہا ہے کہ انھیں ایم آئی ٹی سے 90 فیصد اسکالرشپ کی پیشکش کی گئی ہے۔ 18 سالہ کھنڈ والا نے ایمس میں آل انڈیا دسواں رینک حاصل کیا ہے۔ جبکہ نیٹ میں انھیں 71واں رینک ملا۔ دیگر مسابقتی امتحان میں بھی وہ زیادہ نشانات کے ساتھ کامیاب ہوئی ہیں۔ راجستھان بورڈ 12ویں کلاس امتحانات میں انھوں نے ٹاپ کیا ہے اور ان کا 98.8 فیصد ریزلٹ رہا۔

خاتون ہاکی ٹیم کو ملا اولمپکس کوالیفائنگ کا ٹکٹ

23 جون، 2019، روزنامہ راشٹریہ سہارا (ہیروشیما، یو این آئی) ہندوستانی خاتون ہاکی ٹیم نے ایف آئی ایچ خاتون سیریز فائنلس کے سیمی فائنل میں ہفتہ کو چلی کو 2-4 سے شکست دے کر اس سال کے آخر میں ہونے والے اولمپکس کوالیفائنگ ٹورنامنٹ کا ٹکٹ حاصل کر لیا۔ ہندوستانی ٹیم نے اس شاندار جیت اور اولمپک کوالیفائنگ کا ٹکٹ حاصل کر اپنی ٹیم کی نوجوان فارورڈ لالریسیامي کے والد کو خراج عقیدت پیش کیا جن کا جمع کی صبح انتقال ہو گیا تھا۔ ہندوستانی کپتان رانی نے کل کہا تھا کہ پوری

ٹیم اس دکھ کی گھڑی میں لالریسیامي کے ساتھ کھڑی ہے اور وہ اس ٹورنامنٹ کو جیت کر ان کے والد کو خراج تحسین پیش کرے گی۔ ایف آئی ایچ خاتون سیریز فائنلس کے فائنل میں پہنچنے والی دونوں ٹیموں کو اس سال کے آخر میں ہونے والے اولمپکس کوالیفائنگ ٹورنامنٹ کا ٹکٹ ملنا ہے اور ہندوستان نے یہ ٹکٹ حاصل کر لیا۔ جاپان میزبان ہونے کے ناطے اولمپک میں خودکار طریقے سے کھیلے گا۔ اس سے پہلے ہندوستانی مرد ٹیم نے بھی بھونیشور میں ایف آئی ایچ سیریز فائنلس کا خطاب جیت کر اولمپکس کوالیفائنگ کے لیے کوالیفائی کر لیا تھا۔ ہندوستان کا اب فائنل میں ایشیائی کھیلوں کی طلائی فاتح جاپان کے ساتھ مقابلہ ہوگا جنھوں نے ایک اور سیمی فائنل میں روس کو پنالٹی شوٹ آؤٹ میں 1-3 سے شکست دی۔ مقررہ وقت تک مقابلہ 1-1 سے برابر رہنے کے بعد جاپان نے شوٹ آؤٹ میں جیت حاصل کی۔ ہندوستان کے پاس اب جاپان کے ہاتھوں ایشیائی کھیلوں کے فائنل میں شکست کا بدلہ چکانے کا مکمل موقع رہے گا۔ عالمی درجہ بندی میں نویں نمبر کی ٹیم ہندوستان نے ٹورنامنٹ کے گروپ میچوں میں یوراگوئے کو 1-4 سے، پولینڈ کو 0-5 سے فجی کو 0-10 سے شکست دی تھی اور اب سیمی فائنل میں چلی کو 2-4 سے شکست دے دی۔ ہندوستان کی جیت ڈریگ فلکر گرجیت کور نے پنالٹی کارنر پر دو گول داغے جبکہ نونیت اور رانی نے ایک ایک گول کیا۔ عالمی درجہ بندی میں 16 ویں نمبر کی ٹیم چلی کی جانب سے کیرولینا گارسیا اور مینوٗلا ریوروز نے ایک ایک گول کیا۔ دونوں ٹیموں کے درمیان یہ پانچواں مقابلہ تھا جن میں سے ہندوستان نے چار جیتے ہیں اور ایک ڈرا رہا ہے۔ میچ کا پہلا کوارٹر گول بغیر برابر رہنے کے بعد گارسیا نے میدانی گول کر چلی کو برتری دلائی۔ لیکن گرجیت نے 22 ویں منٹ میں پنالٹی کارنر گول کر ہندوستان کو 1-1 کی برابری دلا دی۔ آدھے وقت تک دونوں ٹیمیں ایک ایک سے برابر تھیں۔ تیسرا کوارٹر شروع ہوتے ہی نونیت نے 31 ویں منٹ میں میدانی گول کر کے ہندوستان کو 1-2 سے آگے کیا۔ گرجیت نے 37 ویں منٹ میں پنالٹی کارنر پر گول کر ہندوستان کی برتری کو 1-3 کر دیا۔ مینوٗلا نے 43 ویں منٹ میں چلی کا دوسرا گول کر میچ میں سنسنی پیدا کر دی۔ آخری کوارٹر میں دونوں ٹیموں کے درمیان زبردست مقابلہ چلتا رہا لیکن کپتان رانی نے 57 ویں منٹ میں ہندوستان کا چوتھا گول داغ کر چلی کے چیلنج کو ختم کر دیا۔

پہلی سعودی خاتون ہواباز کا ہوائی اڈے پہنچنے پر شاندار استقبال

23 جون، 2019 اخبار مشرق، دہلی (ریاض ایجنسی)۔ سعودی عرب کی پہلی خاتون پائلٹ کے حائل کے ہوائی اڈے پر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ دوسری جانب سوشل میڈیا پر بھی ان کی غیر معمولی تعریف و توصیف کی جا رہی ہے۔ العربیہ کے مطابق کیپٹن پائلٹ یاسمین المیمنی گذشتہ روز معاون ہواباز کی حیثیت سے طیارہ اڑاتے ہوئے حائل ہوائی اڈے پر اتریں جہاں ہوائی اڈے کے حکام نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور انھیں پھول پیش کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر بھی پائلٹ یاسمین المیمنی کی غیر معمولی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ یاسمین المیمنی نسما ایئر فضائی کمپنی میں معاون ہواباز کے طور پر تعینات کی گئی ہیں۔ ان کا تعلق حائل سے ہے جہاں وہ گذشتہ روز پرواز کے ذریعے پہنچیں تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ خیال رہے کہ 29 سالہ یاسمین المیمنی نے امریکہ میں ہوا بازی کا لائسنس حاصل کیا تھا جسے سنہ 2013 میں سعودی لائسنس میں تبدیل کر دیا تاہم اس عرصے میں انھیں طیارہ اڑانے کا موقع نہیں ملا۔ یہ پہلا موقعہ ہے جب وہ طیارہ اڑا کر حائل پہنچی ہیں۔ نسما ایئر نے یاسمین المیمنی کو معاون ہواباز کے لیے تعینات کیا ہے۔ اس نے اردن سے ہوا بازی کی تربیت حاصل کی اور امریکہ میں 300 گھنٹے کا ہوابازی کا تجرباتی کورس کیا گیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قانون

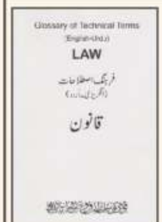

ادارہ

صفحات:440

قیمت:160 روپے

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

مصنف:سید احتشام حسین

صفحات:341

قیمت:105 روپے

اردو کی کہانی

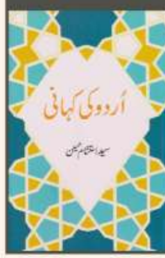

مصنف:سید احتشام حسین

صفحات:104

قیمت:25 روپے

اردو سب کے لیے

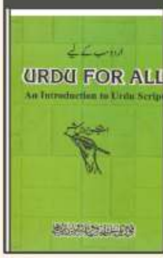

ادارہ

صفحات:116

قیمت:85 روپے

اردو سب کے لیے

مصنف:عبدالودود انصاری

صفحات:121

قیمت:90 روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ

مصنف:محمد حسن

صفحات:373

قیمت:168 روپے

سماجی تحقیق

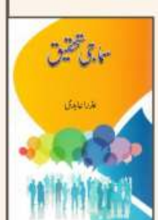

مصنف:عذرا عابدی

صفحات:490

قیمت:215 روپے

جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر

مصنف:ڈاکٹر نریش

صفحات:155

قیمت:90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly July 2019, Vol. 03, Issue: 07
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک
(مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند)
डॉ. रमेश पोखरियाल निशंक
(मानव संसाधन विकास मंत्री, भारत सरकार)

दर्द का सिलसिला

ज़िंदगी की श्वास में
मंज़िलों की आस में
कारवाँ बन बढ़ रहा, दर्द का यह सिलसिला है।

प्यार की एक बूँद को
हर पल तरसते
किंतु बदले में मिले
पत्थर बरसते
कुछ ना पूछो ज़िंदगी से, ग़म सहित क्या–क्या मिला है
कारवाँ बन बढ़ रहा, दर्द का यह सिलसिला है।

इस छोर से उस छोर तक
सभी को परखते रहे,
किंतु पग–पग में मिला छल
जिसके सभी ग़म भी सहे
कौन जाने कब ढहेगा, घोर दुख का ये किला है,
कारवाँ बन बढ़ रहा, दर्द का यह सिलसिला है।

आस की नन्ही किरण
झेलती तम को रही,
कभी तो तूफ़ान कभी
बयार विष की भी बही
सफ़ल कैसे हो सफ़र यह, ज़िंदगी का जो मिला है,
कारवाँ बन बढ़ रहा, दर्द का यह सिलसिला है।

درد کا سلسلہ

زندگی کی شواس[1] میں
منزلوں کی آس میں
کارواں بن بڑھ رہا، درد کا یہ سلسلہ ہے

پیار کی ایک بوند کو
ہر پل ترستے
کنتو بدلے میں ملے
پتھر برستے
کچھ نہ پوچھو زندگی سے، غم سہت کیا کیا ملا ہے
کارواں بن بڑھ رہا، درد کا یہ سلسلہ ہے

اس چھور سے اُس چھور تک
سبھی کو پرکھتے رہے
کنتو پگ- پگ[2] میں ملا چھل
جس کے سبھی غم بھی سہے
کون جانے کب ڈھہے گا، گھور دکھ کا یہ قلعہ ہے
کارواں بن بڑھ رہا، درد کا یہ سلسلہ ہے

آس کی ننھی کرن
جھیلتی تم[3] کو رہی
کبھی تو طوفان کبھی
بیار وش[4] کی بھی بہی
سپھل کیسے ہو سفر یہ، زندگی کا جو ملا ہے
کارواں بن بڑھ رہا، درد کا یہ سلسلہ ہے

1 سانس 2 قدم قدم 3 اندھیرا 4 زہریلی ہوا

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025